عورت



ایک پہیلی

راج کنول

پیش لفظ

کوئی کتاب پیش کرتے ہوئے "پیش لفظ" لکھنا ایک دستور بن گیا ہے، اس لئے مَیں بھی چند سطور لکھ رہا ہوں۔ اسے میرا تعارف سمجھ لیجئے یا میرے افسانوں کا، کیونکہ میرے افسانے وہ حقیقتیں ہیں جو میری اپنی زندگی سے وابستہ ہیں یا اُن لوگوں کی تصویریں ہیں جو میرے بہت قریب ہیں، جنہیں مَیں نے اُن کے حقیقی رُوپ میں دیکھا ہے۔

میری زندگی آہوں اور مُسکراہٹوں سے مرتّب ایک کہانی ہے اور میرے افسانے میری زندگی کی چند جھلکیاں ہیں۔ ہر زندگی کی طرح میری زندگی بھی خوشی اور غم کی منزلوں سے گزری ہے ——— گزر رہی ہے، لیکن مَیں دُوسروں کی طرح غم کو فراموش نہیں کر سکا۔ میرے ذہن میں کچھ مُسکراہٹیں ہیں تو اُن کے ساتھ ساتھ آہیں اور آنسو بھی ہیں ——— اور یہی بات آپ کو میرے افسانوں میں بھی ملے گی، اُن میں ہر رنگ ہے ——— حُسن، محبّت ——— قہقہے، مُسکراہٹیں ——— آہیں، آنسو ———!

مَیں زندگی کا عکّاس و ترجمان ہُوں۔ مَیں نے زندگی کو ہر زاویئے سے دیکھا ہے، مَیں زندگی کو حسین دیکھنا چاہتا ہُوں، مَیں زندگی کو اُس کے نہیں

حسین و دلکش رنگوں میں دیکھنا چاہتا ہوں جن سے اُس کی تخلیق ہوئی ہے ——— آپ بھی میرے ان افسانوں میں ——— میری زندگی کی ان جھلکیوں میں، زندگی کے ہر رنگ کو دیکھ سکیں گے۔

اپنے افسانوں کا یہ مجموعہ مرتب کرتے وقت خیال ہوا کہ اسے کس نام سے موسوم کروں؟ یوں تو بہت سے نام ہو سکتے تھے، لیکن میری رائے میں اس کا صحیح نام ——— "عورت" ہونا چاہیئے یا "عورت ایک پہیلی"! ——— اس لئے کہ اس کتاب کے ہر افسانے میں آپ ایک عورت پائیں گے اور ہر افسانے میں ایک دوسری عورت کو دیکھیں گے۔ آپ ان افسانوں میں عورت کو بہت سے روپ میں پائیں گے، پھر بھی شاید میری طرح آپ عورت کو ایک پہیلی ——— سمجھ میں نہ آسکنے والی پہیلی ہی سمجھیں گے۔

میرے نزدیک شراب، عورت اور زندگی ایک ہی چیز کے کئی نام ہیں۔ ہو سکتا ہے، آپ شراب، کو زندگی نہ کہیں، لیکن اس حقیقت سے تو انکار نہ کرینگے کہ عورت اور زندگی دو چیزیں نہیں ہیں! ——— زندگی کی طرح عورت کو بھی میں نے ہر زاویئے سے دیکھا ہے۔ لیکن عورت اب بھی میرے لئے ایک حسین پہیلی ہے ——— سمجھ میں نہ آنے والی پہیلی ———!!

راج کنول

نئی دہلی ۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء

عَورت

گاڑی کی روانگی کے انتظار میں کھڑے ہُوئے اُس نے ایک نظر پلیٹ فارم پر ڈالی اور بائیں کلائی سامنے بڑھا کر سٹیشن کی گھڑی سے ٹائم ملایا۔ گاڑی چلنے میں ابھی نصف گھنٹہ باقی تھا۔ وہ دو مرتبہ پلیٹ فارم کے ایک سِرے سے دُوسرے سِرے تک گھُوم چُکا تھا۔ اب تیسری بار جانے کا اِرادہ اُسے جچا نہیں پَینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہُوئے اور بے فکری سے سیٹی بجاتا ہُوا وہ اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف چل دیا۔

اُس کی نگاہیں ٹرنک پر بیٹھی ہُوئی رہتک کی جاٹ عَورت سے لے کر بُوڑھے سِکھ کرنل کی، ذرا جوان مگر بدصُورت بیوی تک پُہنچ چکی تھیں لیکن ابھی تک اُسے ایک بھی ایسی عورت نظر نہیں آئی تھی جس کے لئے وہ سیکنڈ کلاس کی ریزرو ڈسیٹ چھوڑ کر تھرڈ کلاس میں بیٹھنے کی سوچ سکتا ہو۔ وہ

اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اُسے پلیٹ فارم پر ایک سیاہ فام بھدّی سی کرسچین لڑکی نظر آئی۔ وہ سوچنے لگا کاش! وہی اُس کے ساتھ سفر کر سکتی ——— اور اُس کی نگاہیں اُس لڑکی کا بہت دیر تک تعاقب کرتی رہیں۔ جب وہ دُور چلی گئی تو باہر دیکھتے ہوئے اُس نے کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے لئے قدم بڑھایا، اور وہ ایک گداز جسم سے ٹکرا گیا۔

"مُعاف کیجئے گا!"

اور دُوسرے ہی لمحے وہ کُود کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ لڑکی اُسے گھُورتی ہُوئی بغیر جواب دیئے چلی گئی۔ اُس کی نگاہیں لڑکی کے جسم کے ساتھ لپٹ کر آگے بڑھنے لگیں۔ لڑکی کے جسم کے دلفریب خم اُس کے ذہن میں پھیلتے چلے گئے۔ جب وہ دُوسرے پلیٹ فارم کے لئے سیڑھیاں چڑھ گئی تو اُس نے ریزرویشن چٹ پر نظر ڈالی

"مِس موہنی ———"

اُس نے دِل ہی دِل میں اُس لڑکی کے حُسن اور نام کی داد دیتے ہُوئے اُس ریلوے کلرک کو کئی گالیاں دے ڈالیں، جس نے اِتنی خوبصُورت لڑکی کا نام بدخط لکھا تھا اور اُس کے جی میں آئی کہ وہ اپنے قریب سے گزرتے ہُوئے ٹکٹ چیکر کے بند گلے کے کوٹ کے بٹن توڑ کر اُس کا گلا دبا کر کہے کہ اُس جیسے ایک بدذوق نے اِتنی حسین لڑکی کا نام اِتنا بھدّا لکھا ہے ——— اور یہ اُس کی سزا ہے ——— پھر دھیرے دھیرے اُس کے ذہن میں وہ

دلفریب خم پھیلنے لگے ـــــــ اور پھر ایک دم اُس کے ذہن کے کسی گوشے سے شکوک اُبھر آئے ، وہ سوچنے لگا ـــــــ شاید وہ لڑکی یُونہی اِس کمپارٹمنٹ میں آئی ہو، اور یہ موہنی کوئی بنگالی ہو ـــــــ موہنی کمار چودھری ـــــــ جب وہ "مس" کے لفظ کو دو تین بار پڑھ چکا تو اُسے تسکین سی محسُوس ہوئی اور اُس نے دِل ہی دِل میں اُن لوگوں کو کئی گالیاں دے ڈالیں جو مردوں کے نام عورتوں ایسے رکھ دیتے ہیں۔ اُسے پچھلے سفر کا وہ واقعہ یاد آگیا جب اُس نے بے پروائی سے ریزرویشن چِٹ پڑھ کر مینا کشی سُندرم کو مالابار کی کوئی حسین دوشیزہ سمجھا تھا اور گاڑی چلنے سے دو منٹ پہلے انجن کے مانند سیاہ، بے ہنگم ایک مدراسی سِگار کا دُھواں اُڑاتا ہُوا کمپارٹمنٹ میں آگیا تھا۔

ایک دُوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی ہُوئی گاڑی کی وِسل نے اُسے چونکا دیا۔ وہ کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ اُس کے سامنے والے برتھ پر بستر پڑا تھا اور برتھ کے نیچے ایک لیدر سُوٹ کیس۔ اُس نے یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ کوئی اور تو اُس کمپارٹمنٹ میں نہیں آرہا، جھک کر سب سیٹوں کے نیچے نظر دوڑائی۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ صرف دس منٹ باقی تھے۔ سگریٹ کیس نکال کر اُس نے سگریٹ سُلگا لیا۔ وہ اپنے برتھ پر بیٹھ گیا اور اُس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا جیسے شاید شملہ تک اُس کے ساتھ ہی جانا ہو۔ اگر ایسا ہُوا، تو کیا چوبیس گھنٹے میں بھی "نرم" نہ پڑے گی ـــــــ؟ ضرور! ضرور!!

——— وہ بڑبڑا دیا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اگر "وہ" ابھی آگئی اور صرف اُسی کو کمپارٹمنٹ میں دیکھا تو شاید سیٹ بدلوا لے۔ وُہ تیزی سے اُٹھا اور پلیٹ فارم پر ایک اندھیری جگہ، ستوُن کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وُہ لڑکی آئی اور اپنے بَرتھ کے ساتھ والی کھڑکی گرا کر باہر جھانکنے لگی ———

وہ اُسے گھُورتا رہا ———

گاڑی نے وِسل دی اور رینگنے لگی۔ وہ تیزی سے لپکا اور اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا ——— جب وہ اندر داخل ہو تو کس طرح گفتگوُ شرُوع کرے ——— گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی ——— مُسافروں کا شور دَب چُکا تھا۔ صرف اِنجن کی وِسلیں اور گاڑی کے پہیّوں کی آواز باقی رہ گئی تھی ——— پلیٹ فارم بُہت پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ سوچ سکا تھا۔

دروازہ بند کر کے وہ اپنے بَرتھ کی طرف بڑھنے لگا تو لڑکی نے اُسے مُشتبہ نظروں سے گھُورا اور گھبراہٹ سے بولی۔

"آپ بھی سفر کر رہے ہیں ———؟"

"جی ———!"

اور وہ اپنے بَرتھ کے نیچے سے بستر نکال کر بچھانے لگا۔

"مَیں گھبرا گئی تھی ——— اگر مَیں نے آپ کا سامان دیکھ لیا ہوتا تو کبھی آپ کو یُوں مخاطب نہ کرتی ——— مُعاف کیجئے گا!"

"آپ نے چور سمجھا ہوگا؟" ——— وہ بستر کو نامکمل چھوڑ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ اُس کی آنکھیں جھک گئیں لیکن اُسے محسوس ہوا کہ اُن نگاہوں میں حجاب نہیں تھا بلکہ رسمی ندامت کا اظہار تھا ——— کوئی جواب نہ پاکر وہ پھر بستر لگانے میں مصروف ہوگیا ——— بستر لگاکر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ماچس ہوگی آپ کے پاس؟" اُس نے دانستہ غلطی کرنے کی کوشش کی اور پھر ایک دم بولا ——— "معاف کیجئے گا"۔

"لیجئے" ——— اور لڑکی نے ایک چھوٹا سا سگریٹ لائیٹر اُس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ لائیٹر تھامتے ہوئے بولا۔

"شکریہ ——— لیجئے سگریٹ!" اُس نے سگریٹ کیس بڑھا دیا۔

لڑکی نے ایک سگریٹ اُٹھا لیا۔ اُس نے لائیٹر جلا کر دونوں سگریٹ سُلگا دیئے۔ پھر ایک طویل کش کھینچنے کے بعد اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اُس کے برتھ کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"مَیں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"بیٹھئے!" ——— اپنی جگہ سے ہلے بغیر اُس نے دعوت دی۔

"آپ کہاں تک جا رہی ہیں؟"

"شملہ ——— آپ؟"

"اِسے حُسنِ اتفاق ہی کہہ لیجئے کہ مَیں بھی شملہ ہی جا رہا ہوں" ——— اور

وہ بے معنی ہنسی ہنس دیا۔

"خوب! آپ شملہ تفریح کے لئے جا رہے ہوں گے؟"

"جی، ہاں! —— وہاں، میرے چچا رہتے ہیں۔ اُنہوں نے گرمیاں شملہ میں گزارنے کا "حکم" دیا ہے —— یُوں مجھے شملہ پسند تو نہیں —— نہ کوئی اچھّی کلب اور نہ اچھّے ریسٹورانٹ، لیکن دہلی کی گرمی بھی تو دوزخ سے کم نہیں۔ —— آپ بھی شاید تفریح کے لئے جا رہی ہوں گی۔"

"جی، ہاں! تفریح ہی کہہ لیجئے۔ لیکن، میرا ارادہ آئندہ دو سال وہیں ٹھہرنے کا ہے ——"

"آپ کے کوئی رشتہ دار ہوں گے وہاں؟"

"جی، نہیں، ایسا تو نہیں ہے —— میرا ارادہ شملہ میں نوکری کرنے کا ہے۔"

"بہت اچھّا خیال ہے" —— اُس نے محض اِس لئے کہہ دیا کہ اُسے کچھ کہنا چاہئے تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا ——

"آپ کو نیند آ رہی ہو گی۔" پھر گھڑی پر نظر ڈالتے ہُوئے ——

"گیارہ بجنے والے ہیں۔"

سگریٹ بُجھ چکے تھے۔ جلی ہُوئی سگریٹ کی راکھ کو جُوتے سے مَسلتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کہے —— لیکن، کڑیاں نہیں ملتی تھیں —— وہ اُٹھتے ہُوئے بولا۔

" آپ کا بستر لگوانے میں مدد کروں ؟"

" شکریہ ! آپ تو تکلف سے کام لے رہے ہیں !"

" میں ؟ نہیں ، آپ ! —— آپ اِدھر بیٹھئے میں بستر لگا دوں ۔"

لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ اُس نے بستر کھولا اور ہموار کر دیا ۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی ۔ وہ اپنے برتھ پر بیٹھتا ہوا بولا ۔

" سگریٹ پئیں گی ، آپ ؟"

" جی ، نہیں ، آج سگریٹ بہت پیئے ہیں ، گلا خراب ہو رہا ہے ۔"

" معلوم ہوتا ہے ۔ آپ بہت کم سگریٹ پیتی ہیں !" وہ اپنا سگریٹ سُلگاتا ہوا بولا ۔

" یہی تین ، چار پیکٹ !"

" یہ تو بہت ہیں —— اتنی زیادہ عادت ہونے پر بھی آپ کا گلا کیوں کر خراب ہو سکتا ہے ۔"

" لیکن آج تو شاید سَو سگریٹ پھونک چکی ہوں ۔"

" اور ، دِل کتنے —— ؟"

وہ کِھلکھلا کر ہنس دی ۔

" آپ بہت اچھا مذاق کرتے ہیں ۔ میں تو اِسے لٹریری کہوں گی ۔"

وہ اُکساہٹ کا منتظر رہا ، لیکن وہ جلدی سے مُنہ ڈھانپتے ہوئے بولی ۔

" گُڈ نائٹ ڈیر !"

"گڈ نائٹ ڈارلنگ!!" اُس نے ہونٹ کاٹتے ہُوئے جواب دیا۔

وہ برتھ پر لیٹ گیا۔ دو ایک مرتبہ موہنی کے برتھ کی طرف دیکھا لیکن وہ شاید سو چکی تھی۔ اُس نے آنکھیں مُوند لیں لیکن اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا وہ سوچنے لگا کہ بجلی بُجھا کر موہنی کے بستر پر جا گرے —— لیکن ہمّت نہیں ہوتی تھی۔ بہت دیر تک وہ باہر پھیلے ہُوئے اندھیرے میں گھُورتا رہا۔ اُس کی آنکھیں تھک سی گئیں۔ ایک نیا سگریٹ سُلگا کر وہ لیٹ گیا۔ تین چار کش جلدی جلدی کھینچ کر وہ نیند میں ڈُوب گیا۔ انگلیوں میں جلتا ہُوا سگریٹ، نیند میں ہاتھ سے گِر کر کچھ دیر تک کمپارٹمنٹ کی زمین پر پڑا سُلگتا رہا اور پھر مایُوسی سے دم توڑ گیا۔

کسی سٹیشن کے ہنگامے نے اُسے جگا دیا۔ وہ آنکھیں مَلتا ہُوا اُٹھ بیٹھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بجے تھے۔ انگڑائی لیتی ہُوئی موہنی بولی۔

"کونسا سٹیشن ہے، ڈیر؟"

"انبالہ۔" اُس نے قیافے سے کہہ دیا۔

وہ اپنے بستر سے اُٹھ کر اُس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اُس کا گھُٹنا اُس کی ران پر پڑا تھا۔ وہ مچل اُٹھا۔ اُس نے موہنی کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا —— کوئی مزاحمت نہ ہُوئی —— اُس کے بُجھے ہُوئے شوق نے کروٹ لی۔

اُس کے ذہن میں وہ دل فریب خم پھیلنے لگے ——— اور اُس کا جسم تن گیا۔

"چائے منگواؤں ؟" وہ کمر کو سہلاتا ہُوا پیار کے لہجے میں پُوچھنے لگا۔

" آیئے ہوٹل میں چلتے ہیں۔ چائے سے تکان کہاں دُور ہو گی ؟"

وہ پلیٹ فارم پر اُتر کر ریسٹورانٹ کی طرف چل دیئے۔ اُس کا ہاتھ اُس کی کمر پر ٹِکا ہوا تھا۔ بیرے نے دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ گوشے کی ایک ٹیبل پر بیٹھتے ہُوئے اُس نے ایک نظر دست بستہ سامنے کھڑے ہُوئے بیرے پر ڈالی اور پھر مُسکراتے ہُوئے موہنی کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔

"کیا لیجئے گا ؟"

"کاکٹیل ٹھیک رہے گی ——— جن، کاکٹیل "

" ایک جن، کاکٹیل اور ایک وسکی، بڑا" ——— اُس نے آرڈر دیا۔

وہ موہنی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اُس کی نگاہیں ہال میں بھٹک رہی تھیں۔ اِس سے اُس طمانیت کا احساس جو اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھنے سے حاصل ہُوا تھا ایک مرتبہ پھر زائل ہو گیا۔

چند لمحوں بعد بیرا ٹیبل پہ گلاس رکھتے ہُوئے بولا۔

"کچھ کھانے کو صاب ——— ؟"

"ہوں، دو پلیٹ مٹن کٹلٹ ـــــ کیا خیال ہے؟" اُس نے موہنی کو مخاطب کیا، جو ایک ہی سانس میں اپنی کاکٹیل حلق میں اُنڈیل رہی تھی۔

"کھانے کی تو ضرورت نہیں ـــــ ہاں! دو پیگ اور منگوا لیجیئے۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر تلخی کا احساس مٹانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

اُس نے آرڈر دیا ـــــ بیرا چلا گیا تو اُس نے سگریٹ کیس نکالا اور موہنی کی جانب بڑھا دیا۔ سگریٹ اُٹھاتے ہوئے اُس نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مُسکرا دی، وہ بھی مُسکرا دیا اور اِس سے پہلے کہ اُس کے ذہن میں وہ دِلفریب خم پھر کروٹ بدلے، شراب آ چکی تھی۔ موہنی نے دونوں پیگ حلق میں اُنڈیل لئے۔ اُس نے بھی ساتھ دیا۔ لیکن شراب پیٹ میں پہنچتے ہی اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی پلکیں خمار سے بھاری ہونے لگی ہیں۔ اُس نے موہنی کی طرف دیکھا ـــــ وہ بہک چکی تھی۔

"چلو ڈیر چلیں ـــــ اگر گاڑی چلی گئی تو شراب بہت زیادہ پینا پڑے گی ـــــ" اُس کی زبان میں لکنت آ گئی تھی اور الفاظ لڑکھڑا رہے تھے۔

بِل کی قیمت میز پر چھوڑ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ موہنی کو سہارا دے کر اُٹھایا۔ ایک دوسرے کی کمر کے گرد بازو لپٹائے ہوئے وہ ریسٹورانٹ سے باہر نکل آئے ـــــ پلیٹ فارم پر کچھ دیر کھڑے ہو کر اُس نے ذہن

پر زور دے کر اپنے کمپارٹمنٹ کا نمبر یاد کیا اور موہنی کو گھسیٹتے ہوئے کمپارٹمنٹ میں لے آیا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ بجلی گُل کرنے کے لئے سوِچ کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ موہنی نے، جو برتھ پر بیٹھی تھی اُٹھ کر اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں ——

"ڈیر —— !"

اُس کا جسم لڑکھڑانے ہی والا تھا جب اُس نے اُس کی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اُسے سہارا دیا —— اور موہنی کو اپنے بستر پر لِٹا کر بجلی گُل کر دی۔

گاڑی نے وِسل دی اور رینگنے لگی ——

باہر بارش پڑنے لگی تھی —— چاند کی ہلکی ہلکی روشنی بھی اندر آنا بند ہو گئی —— کمپارٹمنٹ میں گھُپ اندھیرا تھا ——

"قُلی ساب! قُلی ساب!!"

کِسی سٹیشن کے ہنگامے نے اُسے جگا دیا۔ کالکا سٹیشن آ گیا تھا نیم باز آنکھوں سے اُس نے موہنی کی طرف دیکھا اور اُس کے جسم کو سہلاتا ہُوا وہ بولا۔

"ڈارلنگ! کالکا آ گیا ہے —— اُٹھو، گاڑی بدلنا ہو گی ——"

موہنی انگڑائیاں لینے لگی۔ وہ سامان اکٹھا کرنے لگا۔ جب تمام سامان دُرست کر چُکا تو کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"ڈارلنگ کار سے چلیں یا گاڑی سے ——؟"

"کار ٹھیک رہے گی ـــــ جلدی بھی پہنچ جائیں گے اور پھر سولن کچھ پینے کو بھی مل جائے گا۔" وہ بے حجابانہ مسکراتی ہوئی بولی۔

ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ پلیٹ فارم پر اتر آئے سامان کار میں رکھوا کر وہ ریسٹورانٹ میں بیٹھ گئے۔

"بئیر اور آملیٹ ٹھیک رہے گا ـــــ؟"

"جو آپ کی پسند۔"

"یہ نہیں، جو آپ کی پسند!"

"سینڈوچز اور منگوا لیجئے ـــــ یہ کافی ہوگا۔"

بیرے کو آرڈر دے کر اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہیں موہنی کے چہرے پر آ کر رک گئیں۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"آپ تو رات بہک گئی تھیں ـــــ"

"یہ بُرا تو نہیں ہوا ـــــ کیوں؟"

بیرا ٹیبل پر کھانے کا سامان رکھنے لگا۔ ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ کھانے میں مشغول ہو گئے۔ کھانے کے بعد بئیر کے چند گھونٹ حلق سے اترتے ہی ان کی طبیعت شگفتہ ہو گئی۔ رات کی پی ہوئی شراب سے چہرے پر جو تکان کے آثار پیدا ہوئے تھے دب گئے اور اس کی جگہ ایک خوشی نے لے لی۔

"زندگی میں ایسی رومینٹک راتیں بہت کم آتی ہیں ـــــ!" وہ بولا۔

"ہوں ـــــــ" موہنی نے جواب دیا۔

اور اُسے محسوس ہوا جیسے موہنی کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ـــــ لیکن، شراب، عورت اور تنہائی، اِن کا اِتصال اُس کی زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا تھا ـــــــ بئیر کے چند اور گھونٹوں نے یہ احساس بھی کچل دیا ـــــــ وہ پھر مُسکرانے لگا۔

"بئیر منگواؤں ؟"

"نہیں سولن چل کر پئیں گے ـــــــ"

وہ کار میں جا بیٹھے۔ سکھ ڈرائیور نے اُنہیں گھورا اور کار میں بیٹھ کر سامنے لگا ہوا شیشہ اِس انداز سے نیچا کر لیا کہ وہ دیکھ سکے، پچھلی سیٹ پر کیا ہو رہا ہے۔ کار کا دروازہ ایک غیر رومانٹک انداز سے "ٹھاک" کرتا ہوا بند ہوا۔ اور کار تارکول کی سیاہ سڑک پر دَوڑنے لگی۔

"سکھ ڈرائیونگ میں ماہر ہوتے ہیں ـــــــ" وہ انگریزی میں بولی۔

سکھ ڈرائیور نے مُڑکر اُسے گھورا۔ شاید وہ "سکھ" لفظ پر غور کر رہا تھا اور شاید یہ بھی سوچ رہا ہو گا کہ اگر اُسے اپنے گاؤں میں ایسی عورت نظر آ جائے تو وہ اُسے بھگا کر لے جائے گا۔ خواہ اُسے دو، چار خون ہی کیوں نہ کرنا پڑیں۔

"اور اَسّی فی صدی ایکسی ڈنٹ، اِنہیں کی بہترین ڈرائیونگ کے باعث ہوتے ہیں ـــــــ" اُس نے انگریزی میں جواب دیا۔

وہ کھلکھلاتی ہوئی اُس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی ـــــــ سکھ ڈرائیور

نے اس ڈرامے کو سامنے لگے ہوئے شیشے میں دیکھا اور پھر مڑ کر اُسے گھورا، شاید اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اُسے کار سے باہر پھینک دے اور پھر کسی امریکن سپاہی کی طرح، ایک ہاتھ اِس لڑکی کی کمر پر رکھ کر کار چلائے۔

کار بل کھاتی ہوئی سڑک پر تیزی سے چڑھتی گئی ——— وہ اُس کی گود میں سر رکھے لیٹی رہی ——— اور سولن آگیا۔

ڈاک بنگلے میں بیٹھ کر بئیر کی چار بوتلیں پیٹ میں ڈال لینے کے بعد وہ بولا۔

"ڈارلنگ! اگر آج رات یہیں ٹھہرا جائے تو ———؟"

"نہیں، ڈیر ——— ! مجھے کل انٹرویو کے لئے جانا ہے اور میجر جوزف نے سفارش کا وعدہ بھی کیا ہے ———" وہ ناز سے بل کھاتی ہوئی بولی۔

"میجر جوزف؟" اُس کے منہ سے نکل ہی گیا۔

"وہ میرے بہت پرانے دوست ہیں۔"

جواب سُن کر وہ کچھ افسردہ سا ہو گیا۔

"مَیں تمہیں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی ———" وہ اُس کے گالوں کو تھپتھپاتی ہوئی بولی ——— اور وہ کچھ سوچتا رہا۔

"چلو اب چلیں!" وہ اُسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ وہ بل کے پیسے ادا کر کے باہر آ گئے۔

سِکھ ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا، اُنہیں گھورا ——— دروازہ

"ٹھاک" سے بند ہو گیا۔ اُسے یہ "ٹھاک" بہت ناگوار محسوس ہوئی لیکن وہ سکھ ڈرائیور کی وحشی آنکھوں سے گھبرایا ہُوا کچھ نہ بولا۔

کار پھر دوڑنے لگی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ بئیر کے خمار اور موسم نے اُسے پھر رومانٹیک بنا دیا۔ اُس نے موہنی کو باہوں میں جکڑ لیا تو وہ اُسے دُور کرنے کی سعی کرتی ہُوئی انگریزی میں بولی۔

"تمہیں تیسرے آدمی کی موجودگی کا بھی احساس نہیں ہوتا ——؟"

جواب میں اُس نے مخمور آنکھوں سے صرف اُس کی طرف دیکھا —— سکھ ڈرائیور بار بار مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کی مُسکراہٹ گھنی مُوچھوں میں دب گئی تھی —— لیکن وہی مُسکراہٹ آنکھوں میں چمک اُٹھی تھی ——

موہنی اُس کی گود میں سر رکھے سو گئی اور بئیر کے ٹوٹتے ہُوئے خمار سے اُس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

"ارے، آپ تو بیل بیچ کر سوئے ہُوئے ہیں" وہ اُس کے شانوں کو جھنجھوڑتی ہُوئی بولی۔

اُس نے انگڑائی لی اور اُسے باہوں میں جکڑنے کے لئے بازو بڑھا دیئے۔

"باہر تو دیکھئے ——" وہ پرے ہٹتی ہُوئی بولی۔

اُس نے باہر دیکھا۔ شملہ کا موٹر سٹینڈ آ چکا تھا اور چند ہی لمحوں بعد

اُسے کار سے اُترنا تھا۔

"آئی۔ایم۔سوری!" وہ جھینپی، ندامت آمیز ہنسی ہنس دیا۔

کار ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی۔ وہ دونوں باہر نکل آئے۔ قُلی کو اپنا سامان اُٹھانے کی ہدایت کر کے وہ اُس سے بولی۔

"مَیں آپ کو زندگی بھر نہ بھُلا سکوں گی۔ اِس خوشگوار سفر کا شکریہ"۔۔

اور پھر وقفے کے بعد ——— "آپ کا نام جان سکتی ہوں؟"

"فرینک ——— فرینک مارٹن"۔

"ارے آپ بھی کرسچین ہیں؟ ——— مجھے موہنی کہتے ہیں ——— ایم ڈینیل"

قُلی سامان اُٹھا چکا تھا۔

"مجھے اجازت دیجئے" وہ مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"رکشا میں چلے جائیے!"

"مجھے نزدیک ہی جانا ہے"۔

"آپ میرے ساتھ ٹھہریئے!"

"جی، نہیں، شکریہ! مَیں میجر جوزف کے ساتھ ٹھہروں گی"۔

"اچھا پھر مُلاقات ہوگی ———!"

"او۔ کے" وہ آنکھوں پر گوگل چڑھاتی ہوئی بولی اور قُلی کے ساتھ چل دی۔ وہ اُسے دیکھتا رہا جب تک وہ لوئر مال کا موڑ مڑ کر آنکھوں سے اوجھل

نہ ہو گئی ——— اور اُس کے ذہن میں وہ دلفریب خم پھیلتے چلے گئے۔

پاس کھڑے ہُوئے رِکشا قُلی کی آواز نے اُسے چَونکا دیا۔

"کہاں جانا ہے، ساب ؟"

"لاؤنگ وڈ!"

وہ رِکشا میں بیٹھ گیا اور رِکشا کے پہیئے تھکے تھکے سے گھُومنے لگے۔

دُوسری شام کو اپنے اَدیب دوست کے ساتھ مال روڈ کے پندرہ، بیس چکّر کاٹنے کے بعد تھک کر وہ ڈیویکوز میں بیٹھ گیا۔

"مَیں کہتا ہُوں وہ نہیں آئے گی۔ وہ عورت ہے اور دُنیا کی ہر عورت بے وفا ہے" ——— ادیب بولا۔

"ارے، میرے شاعر اور ادیب! تُم نے دُنیا کی ہر عورت دیکھی کہاں ہے؟ تُم نے امیر گھرانے کی ایک لڑکی سے عشق کیا، وہ تمہیں نہ مِل سکی ——— تو اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ دُنیا کی ہر عورت بے وفا ہے؟ ——— میرے دوست! تُم ایک اور عشق کر کے دیکھو ———"

اُس نے سامنے کھڑے ہُوئے بَیرے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ حالانکہ اُس کا کوئی مطلب نہ ہو سکتا تھا۔ پھر وہ اَدیب سے بولا۔

"بھئی کیا پیوُ گے؟"

"کچھ منگوا لو!"

"ادیب اور شاعر، شراب کے لئے خاص مذاق رکھتے ہیں —— رم یا ٹھرّا —— اس لئے پوچھا تھا ——"

وہ دونوں مسکرا دیئے اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ بیرے کے ہونٹوں پر بھی پھیل گئی۔

"دو، سکاچ" اُس نے آرڈر دیا۔

وِسکی آنے تک اُن دونوں کی نگاہیں اِدھر اُدھر بیٹھی ہوئی عورتوں کے جسم ٹٹولتی رہیں۔ جب اُس کی نگاہیں دروازے پر پہنچیں تو موہنی ایک ملٹری افسر کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اُس نے کہنی سے ادیب کو ٹہوکا دیا اور بولا۔

"وہ دیکھو! —— میں نہ کہتا تھا وہ ضرور آئے گی"

موہنی اپنے ساتھی کے ساتھ جب اُس کے ٹیبل کے قریب پہنچی تو وہ مسکراتا ہوا استقبال کے لئے اور اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دینے کے لئے اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہیلو —— !" وہ مسکراتا ہوا بولا۔

موہنی نے اُس کی طرف اجنبیت سے دیکھا اور مُنہ پھیر کر آگے بڑھ گئی۔

وہ کرسی میں گر گیا اور گلاس میں پڑی ہوئی وِسکی ایک ہی بار حلق میں انڈیل لی۔ اُس کا ادیب دوست فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ گلاس

ہونٹوں سے لگاتا ہوا بولا۔

"میرے دوست دُنیا کی ہر عورت بے وفا ہے۔ خواہ وہ کسی امیر گھرانے کی عورت ہو، چاہے سوسائیٹی گرل"۔

"بیرا ——!" وہ زور سے چلّایا اور بیرا بھاگتا ہوا اُس کی میز پر آ گیا۔

"وسکی!!" وہ پھر چلّایا۔

وسکی آتی چلی گئی اور وہ اُس وقت تک پیتا چلا گیا جب تک اُسے احساس رہا کہ اُس میں زندگی باقی ہے —— اور موہنی کوئی عورت ہے ——

انگیا

مال روڈ پر سے گزرتے ہوئے میری نظر شوکیس میں رکھی ہوئی ایک فوٹو پر جا پڑی۔ فوٹو کے اِدھر اُدھر دو چار انگیا پڑی تھیں ——— فوٹو کمر تک برہنہ ایک انگریز عورت کی تھی، جس کے سینے پر انگوری رنگ کی انگیا پڑی ہوئی تھی۔

"یہ جرابیں بہت اچھی ہیں۔ میں نے پار سال خریدی تھیں۔ خوب ساتھ نبھایا انھوں نے۔"

ایک اینگلو انڈین لڑکی جس کی سیاہ ٹانگیں ننگی تھیں، مجھے گھورتی ہوئی نکل گئی۔

"انگلستان کی بنی ہوئی چیزیں ہوتی ہی بہت اچھی ہیں۔" ترلوک نے جواب دیا۔

میں نے ترلوک کا ہاتھ دبایا اور ہم شوکیس کے قریب ہو گئے۔ میری نگاہیں اُس فرنگی عورت کے سینے پر چڑھی ہُوئی انگیا میں بہت سی باتیں ڈھونڈنے لگیں ——— انگیا کا بنگلہ، انگیا کا پان، ٹھرا، گھاٹ، چڑیا، کٹوریاں ——— میری نگاہیں بہت دیر تک اُلجھی رہیں ———!

"انگیا کی کٹوریاں"۔ ترلوک نے مجھے کہنی سے ہچوکہ دیا۔ میں نے مُنہ پھیر کر دیکھا۔ سامنے سے دو غریب سی پنجابی عورتیں آ رہی تھیں۔ میری نگاہیں اُن دونوں کے سینے ٹٹولنے لگیں۔ انگیا کا بنگلہ، پان، ٹھرا، گھاٹ، چڑیا، کٹوریاں، کچھ بھی نہیں۔ صرف لمبے لمبے کرتوں میں پستان ایسے ہل رہے تھے، جیسے کسی درخت پر قریب قریب لٹکی ہُوئی ناشپاتیاں۔ میری نگاہیں واپس اُسی برہنہ فوٹو پر آ گئیں۔ وہ فرنگی عورت مُسکرا رہی تھی، جیسے مجھ پہ ہنس رہی ہو، جیسے کہہ رہی ہو ——— دیکھا تُم نے؟ یہ ہے حُسن تمہارے ہندوستان کا! اور تمہیں اسی پر فخر ہے۔ ہونہہ! اگر انہی عورتوں کے پاس میرے ایسی BODICE ہوتیں تو آج اِن کا حُسن ایسا بدنما نہ ہوتا۔ میں اُن عورتوں کی پھٹی ہُوئی بیائیوں، میلے کچیلے کپڑوں اور سُوکھے ہُوئے بالوں کو بھول گیا۔ میں سوچنے لگا ——— کاش ہندوستان کی ہر عورت کے پاس ایک انگیا ہوتی، تاکہ وہ اپنے شباب کے غرور کی توہین نہ ہونے دیتی اور انگیا ایسی نہیں جیسی میں یُوپی اور دہلی میں دیکھ آیا ہُوں۔ اِن لمبے لمبے کُرتوں کے نیچے ایک ایک انگیا ہوتی۔ وہ عورتیں ہمارے کسی قدر قریب

ہو گئی تھیں۔ ترلوک نے میرا بازو تھاما۔

"مال تو اچھّا ہے۔"

میں نے اُس کا بازو جھٹک دیا اور پھر شوکیس میں جھانکنے لگا۔

ایک عورت دِھیرے سے بولی ——

"دیکھ ری، میم صاحب نے کیا پہنا ہے!"

"مجھے تو شرم آتی ہے۔" دُوسری نے جواب دیا۔

مَیں ایک دَم پلٹا۔ میرا سر شوکیس کے بڑے شیشے کے فریم سے ٹکرایا، دماغ چکرایا اور مَیں بڑبڑانے لگا۔ "دیکھا، دیکھا تُم نے میم صاحب، یہ سب تُم میں نہیں ہے۔ یہ انگیا، ہاں ایسی ہی انگیا۔ ایسی ہی کیوں تُم اِسی کو اُتار کر اِس غریب کو دے دو تو بھی یہ عورت جس کی بیائیاں پھٹی ہُوئی ہیں، جس کے کپڑوں پر جا بجا پیوند لگے ہُوئے ہیں —— اِس سِلک کی بنی ہُوئی انگیا کو پہن کر تمھاری طرح تصویر نہ بنوائے گی۔ اِس پر مجھے فخر ہے۔ مجھے ہی کیوں سارے ہندوستان کو فخر ہے۔ ہم ہندوستانیوں کی تہذیب اُونچی ہے، بہت اُونچی، جسے تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔"

ایک ہاتھ شوکیس کے اندر گیا۔ بھدّی بھدّی سی اُنگلیوں والا ہاتھ۔ دُکاندار نے وہ تصویر اُٹھالی۔ شاید وہ اُسے کسی کو دِکھانے لگا تھا۔ مَیں سوچنے لگا —— یہ کِسے دِکھا رہا ہوگا؟ ضرور —— کوئی اینگلو انڈین ہوگی۔ اِتنی بے حیائی؟ —— نہیں نہیں۔ ایک ہندوستانی عورت ایسا کبھی

نہیں کہہ سکتی۔ میرا سینہ تن گیا۔ میں ابھی اِسی انتظار ہی میں تھا کہ دُکاندار پھر تصویر کو شوکیس میں رکھ دے کہ مسز ورما بچّے کی اُنگلی پکڑے مُسکراتے ہُوئے دُکان سے باہر نکلیں۔ میں نے پلٹ کر شوکیس میں دیکھا۔ اُس فرنگی عورت کی تصویر ایک اور پوز میں پڑی مُسکرا رہی تھی۔ مسز ورما کی باریک سفید کرتی سے انگوری رنگ کی انگیا ساڑی کے ساتھ میچ کرنے کو اپنا رنگ اُبھار رہی تھی۔

"ہیلو ——— کہئے کیا دیکھا جا رہا ہے ———؟" مسز ورما نے اپنے سینے پر سے ساڑی کا پلّو ڈھلک جانے دیا۔

"جی، جی، یُونہی جُرابیں دیکھ رہا تھا۔ آپ کہئے ———!" میں نے جواب دیا۔

"میں تو ذرا یُونہی انگیا دیکھنے آئی تھی اور صرف ایک درجن لی ہیں۔" پھر ذرا وقفے کے بعد بولیں "اچھا، اب اجازت دیجئے۔ وہ ہیں نا ہمارے کرنل صاحب، اُن سے APPOINTMENT ہے۔"

اِن کا خاوند جنگ پر گیا ہُوا ہے اور یہ یہاں کبھی کسی کا اور کبھی کسی کا پہلو گرما رہی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی میرے دماغ میں الیگزینڈر ڈوماس کے ناول "انتھونی ایڈورس" کے کردار گھُومنے لگتے ہیں۔ کیسے ناول کی ہیروئن ایک بچّہ ہوتے ہُوئے بھی نپولین کے ساتھ شہرت اور دولت کے لئے محبّت کرنے لگتی ہے اور انتھونی افریقہ میں غلاموں کی تجارت شروع کر دیتا ہے، تاکہ وہ ایک دن بہت دولت کے ساتھ آئے اور اپنی بیوی کو ایک ایسی جگہ

لے جائے، جہاں وہ آرام کی زندگی بسر کر سکیں ——— مَیں اکثر سوچا کرتا ہُوں، اگر الیگزینڈر ڈوماس نے یہ ناول نہ لکھا ہوتا تو مَیں ضرور لکھتا ———!

اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا اور مال روڈ پر لگے ہُوئے گہرے ہرے رنگ کے بلبوں کی روشنی میں ہر شے انگوری نظر آ رہی تھی۔ گہرے، ہلکے، انگوری، عنابی آنچل سینوں پر بل کھا رہے تھے اور کبھی جب خُنک ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا، تو آنچل ڈھلک جاتے اور سفید سفید، انگوری، انگوری انگیاں نمایاں ہو کر اپنی بہار دکھانے لگتیں۔

میری نگاہیں جُھک گئیں اور غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ پتلون کی جیب میں چلا گیا اور میرے ہاتھ میں وہ چِٹ آگئی جس پر میری بیوی نے انگیا کی فرمائش لکھ دی تھی اور مجھے اُس کی بات یاد آگئی "انگوری لانا۔ آپ کہا کرتے ہیں نا تجھ پر یہ رنگ بہت کِھلتا ہے۔"

مَیں نے ترلوک کا بازو تھاما اور ہم دھیرے دھیرے اُس دُکان کی طرف چلنے لگے، جہاں وہ میم صاحب کی تصویر شوکیس میں مُسکرا رہی تھی ——— اُس شیڈ میں سے جہاں کوئی ٹکٹ نہیں لگتا اور جہاں مہاجرین سارا دن بیٹھے بیڑی کے لمبے لمبے کش کھینچتے ہوئے حکومت کی پالیسی پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں، کسی نے آواز دی ———

"کیوں بھئی شام سُندر، تیرا اکونٹنٹ ٹرانسفر ہو گیا ———؟"

جواب تو "نہیں" تھا، لیکن مَیں سوچنے لگا، کتنا خوش قسمت ہے یہ

شخص ؟ اِس کے پاس اکوئنٹ تو ہے ۔اُن عورتوں کے خاوندوں کے پاس جن کے پستانوں کو انگیا کی سخت ضرورت ہے ، اگر اکوئنٹ ہوتے ، تو یقیناً وہ بھی اُن کے سینوں کو اُبھار دیتے ۔میں نے اپنے ہاتھ میں اُن نوٹوں کو مَسلا ، جن سے مجھے اپنی بیوی کے لئے انگیا خریدنی تھی اور جو میں نے انگوٹھی بیچ کر صُبح حاصل کئے تھے ۔میرے قریب سے دو عورتیں باتیں کرتی ہوئی گذر گئیں ۔میرے کانوں میں ایک لفظ پڑا "ہتر نار تھی" ۔ ایک بار پھر میں نے اُن نوٹوں کو ہاتھ سے مَسلا اور مجھے ہنسی آگئی ——— اکوئنٹ ! ———

ہم شوکیس کے قریب پہنچ چکے تھے میم صاحب مسکرا رہی تھیں ہم دکان کے اندر چلے گئے اور میں نے دکاندار سے کہا ۔

" ذرا BODICE دکھائیے " ۔

دکاندار نے پہلے میرے لمبے لمبے پریشان سوکھے بالوں کو دیکھا اور پھر خاصی بڑھی ہوئی داڑھی کو ، جو ایسی معلوم ہو رہی تھی ، جیسے جیل سے ایک مہینے کے بعد آیا ہوں ، وہ مسکرا دیا ۔میں سوچنے لگا ——— ارے تجھے کیا معلوم ۔ادیب ہوں ادیب ! تجھے یہ نہیں معلوم کہ میرے ان لمبے لمبے پریشان بالوں کو اور بڑھی ہوئی داڑھی ہی کو دیکھ کر مشاعروں میں لوگ مجھے سٹیج پر بٹھا دیتے ہیں اور میں قدرے زور سے بڑبڑا دیا " لیکن مجھے تو انگیا چاہیئے ۔ ہے انگوری ؟ "

" جی ہاں ۔ انگوری لیجئے ۔یہ دیکھئے " وہ دونوں اُبھاروں کو کھینچتے ہوئے

بولا۔ "اِن میں ELASTIC ہے یعنی ربڑ ہے۔" شاید اُسے احساس ہوگیا تھا کہ مَیں ELASTIC لفظ کو نہ سمجھ سکا ہوں گا۔ "یہ ہر سائز پر فٹ آجاتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ایک پلیٹ دیجئے۔" ہم دُکان سے باہر نکل آئے۔ میم صاحب مُسکرا رہی تھیں۔

ہوٹل میں ایک ایک پیگ وِسکی پینے کے بعد، بازُو میں بازُو ڈالے ہم گھر کی طرف چلنے لگے۔ مال روڈ کی تارکول کی سڑک کے بعد کچی سڑک شرُوع ہوگئی تھی، جس پر جا بجا گڑھے تھے۔ سامنے سے ایک عورت آرہی تھی۔ اُس کا پاؤں ایک طرف کو مسک گیا۔ ڈھیلے ڈھالے کُرتے میں اُس کے پستان کسی درخت پر ہوا سے ہلتی ہوئی ناشپاتیوں کی طرح ہلے۔ ترلوک نے اُسے بڑھ کر سنبھال لیا اور بولا ——

"اچھّا مَیں اِنہیں چھوڑ آؤں۔"

"ہاں! ہاں! ضرُور۔" مَیں نے جواب دیا اور مَیں سوچنے لگا۔ ترلوک اُس عورت پر کتنا بڑا احسان کرنے لگا ہے۔ غریب کو ڈھیر بندھانے لگا ہے۔ صرف اِس لئے نا کہ اُس عورت کے بالوں میں سینٹ نہیں ہے، چہرے پر پاؤڈر نہیں ہے اور سینے کا اُبھار قائم نہیں ہے۔ اِس لئے نا کہ اُس کے پاس سفید ریشمی قمیص نہیں ہے، جس میں سے انگوری رنگ کی انگیا نمایاں ہو سکے اور

اگر اُس عورت میں یہ سب کچھ ہوتا تو شاید ترلوک کو اِتنا حوصلہ بھی نہ ہوتا کہ وہ پوچھ سکے "آپ کے چوٹ تو نہیں آئی ؟"

میرا گھر آ گیا تھا۔ گھر والوں کی نظریں بچا کر میں دِھیرے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ "وہ" سامنے بیٹھی سوئیٹر بُن رہی تھی۔ سوئیٹر پلنگ پر رکھ کر اُس نے آ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ میں نے اُس کا مُنہ اپنی طرف گھمایا ہی تھا کہ وہ مجھ سے پرے ہٹ گئی۔

"آج پھر پی آئے ہیں آپ !"

"نہیں بھئی، دانت میں درد ہو رہا تھا اِس لئے ڈاکٹر سے سپرٹ لگوا آیا ہوں۔"

"میری چیز ——— ؟"

"اوہ انگیا !" میں نے کوٹ کی جیب سے لفافہ نکال ہاتھ پر دھر دیا۔

"لیکن ہاں، دیکھو نرمل، وہی ساڑی پہن لو۔ انگوری اور وہ سفید بلوز۔"

"لیکن ٹرنک تو بابوجی کے کمرے میں ہے۔"

"تو پھر چلو اِسی کو پہن لو۔"

"صِرف یہ ——— ؟"

"کیا ہرج ہے۔"

میں سوچنے لگا ——— ٹھیک ہی کہتا تھا وہ گنجے سر اور بڑھی ہُوئی توند والا دکاندار۔ یہ ہر سائز پر فٹ آجاتی ہیں ——— میں نے

ایک ہاتھ اُس کی کمر پر رکھا، ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر سینے پر پھیرنے لگا اور میری اُنگلیاں ٹٹولنے لگیں ——— انگیا کا گھاٹ، انگیا کی کٹوریاں! وہ مُسکرا دی۔ مجھے یُوں محسُوس ہونے لگا، جیسے فضا میں ایک قہقہہ گونج اُٹھا ہو، جیسے میری باہوں میں میری بیوی نہ ہو، وہ فرنگی عورت ہو، جس کی تصویر مال روڈ کی ایک دُکان کے شوکیس میں پڑی مُسکرا رہی ہے جسے ہر آدمی صرف ایک انگیا پہنے ہُوئے جب چاہے دیکھ لے ؛

میری ڈائری کے چند ورق

۲۷ر جون ——————

آج مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ بھابی کے کمرے میں کوئی لڑکی آئی اور اُن سے باتیں کرنے لگی۔

"آپ کے گھر سے تو ہر وقت گانے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ جب سے ہم لوگ آئے ہیں جی لگا رہتا ہے اور جب ریڈیو کا پروگرام نہیں ہوتا تو یہ گلا کون پھاڑا کرتے ہیں؟"

"ارے تُم نہیں جانتیں قمر کو؟" بھابی بولیں "میرے دیور ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں یہ آپ کے دیور؟" کسی نے پُوچھا۔

"کرتے کیا ہیں، بس آج کل چھُٹیاں ہیں نا کالج سے، سارا دِن یا تو گانا ہوتا ہے یا تمام سال کی نیند اُتاری جاتی ہے۔ لیکن ہاں نجمہ، ذری آہستہ بولو

قمر برابر والے کمرے میں ہیں۔ بہت گرم طبیعت پائی ہے۔ بس جھٹ پارہ چڑھ جاتا ہے۔"

اور کوئی کھلکھلا کر ہنس دیا ———

مجھے واقعی غصّہ آنے لگا۔ دراصل میں اتنی گرم طبیعت کا آدمی تو نہ تھا، لیکن نہ جانے کیوں گھر میں ایسا سمجھا جاتا تھا۔ میں نے آواز دی ———

"بھابی ——— بھابی جان!"

"کیا ہے جی؟" وہ سمجھ گئیں کہ میں نے سن لیا ہے۔

"دیکھو بھابی، اگر تم نے پھر کسی سے میرے متعلق کوئی بات کی تو اچھا نہ ہوگا۔ میں ابا جان کو خط لکھ دوں گا کہ بھابی مجھے ہمیشہ تنگ کرتی رہتی ہیں۔ پھر دیکھنا کیسی جھاڑ پڑتی ہے!"

"ارے میں تو نجمہ سے کہہ رہی تھی کہ بڑے خوبصورت ہیں ہمارے دیور۔ ایک دفعہ بات کر دیکھو۔ اتنی محبت سے پیش آتے ہیں کہ بس نہ پوچھو۔" بھابی وہیں سے بولیں اور کوئی بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ غالباً وہ نجمہ تھی۔

بھابی میرے کمرے میں چلی آئیں اور بولیں "کیوں جی، ہم کسی سے بات بھی نہ کریں؟"

"آپ جی بھر کر باتیں کیجیے، لیکن مہربانی کر کے اپنے کمرے میں چلی جائیے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم نہیں جائیں گے۔ ہمارا دل تو باتیں کرنے کو چاہ رہا ہے۔" بھابی

بولیں۔

"تو بھابی، اچھا یہ ہوگا کہ بھیّا کو فون کر دُوں کہ جلد چلے آئیے۔ بھابی جان باتیں کرنے کو بے تاب ہو رہی ہیں۔"

"ہشت۔ تم بہت شریر ہو گئے ہو قمر۔" یہ کہتی ہوئی بھابی کمرے سے چلی گئیں۔

جب کبھی مَیں بھیّا کا نام بھابی کے سامنے لے دیتا تو وہ شرما جاتیں، اُن کے چہرے پر شفق پھُوٹ پڑتی۔ میرا جی بھی چاہنے لگتا کہ کسی کے سامنے کوئی میرا نام لے اور وہ شرمانے لگے۔

۲۸ جُون

آج دوپہر کا کھانا کھاتے ہُوئے مَیں نے بھابی سے کہا۔ "اچھا بھابی، ایک بات بتاؤ گی؟"

"کیا ہے جی۔ ہم سے بات مت کرو۔" وہ غُصّے میں بھری ہُوئی بولیں۔

"اچھا بھابی، اگر تم بھیّا سے لڑ پڑو تو اِس کا مطلب یہ کہ ہماری بھی خیریت نہیں۔ اگر تم نہیں چاہتیں کہ ہم تمہارے پاس رہیں تو صاف صاف کہہ دو ہم کل نہیں، آج شام ہی کی گاڑی سے دہلی چلے جائیں گے۔"

"ارے، یہ تُم سے کِس نے کہا ہے؟ آج دراصل ہمارا جی باتیں کرنے کو نہیں چاہتا۔" وہ مُسکراتی ہوئی بولیں۔

"دیکھو بھابی! تُم سے ابھی بچپن نہیں گیا۔ ہم ہیں تُم سے چھوٹے عُمر میں

تمہارا فرض ہے کہ تم ہماری ہر غلطی کو معاف کر دو، غصّے سے نہیں پیار سے۔"

" اچّھا اچّھا تم مجھے بناؤ مت۔ صاف کہو، اِتنی خوشامد یں کیوں ہو رہی ہیں ؟"

" بھابی، میں تم سے ایک بات ——— بھابی، کل شام تم کس سے باتیں کہہ رہی تھیں ؟"

" کل تو میں اُس کہارن سے کہہ رہی تھی کہ پانی جلدی گرم کیا کر وہ ہمارے دیور سیر کرنے بہت جلدی چلے جاتے ہیں۔" وہ آنکھیں مٹکا کر بولیں۔

" بھابی جان، کیا ہوا جو ہم سیر کرنے نہیں جاتے۔ آج کل ہماری نیند جلدی نہیں ٹوٹتی۔" میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

" میں آپ کو خوب جانتی ہوں قمر صاحب۔"

" دیکھو بھابی، مذاق کی حد ہوتی ہے۔ مجھے غصّہ آگیا تو ———"

"... کیا مار ڈالو گے کسی کو ؟"

" جی نہیں تو کیا چھوڑ دوں گا۔"

" ارے آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ میں بتائے دیتی ہوں لیکن ایک شرط ہے، وہ یہ کہ کل سنیما لے چلنا ہوگا ——— اور ہاں مٹھائی کھلاؤ تو۔"

" مٹھائی سے تمہاری طبیعت کبھی اُکتاتی نہیں۔ جس بات میں دیکھو مٹھائی ——— مٹھائی ———"

" اچّھا بھئی تم مٹھائی نہ کھلانا۔ لو، میں تم پر یوں ہی احسان کئے دیتی

ہوں۔ کل شام جو مجھ سے باتیں کر رہی تھیں، وہ تھیں نجمہ۔ یہ جو ہمارے بنگلے کی بغل میں بنگلہ ہے، یہاں رہتے ہیں یہ لوگ۔ اِن کے والد صاحب کا دفتر گرمیوں کے لئے یہاں آیا ہے ——— ارے قمر، وہ دیکھو۔"

مَیں بھابی کے پاس جا کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ نجمہ دھانی چُنری اوڑھے ہلکے سے ہرے رنگ کا سُوٹ پہنے ہمارے بنگلے کی طرف آ رہی تھی۔ اُس نے ہمارے بنگلے کا پھاٹک کھولا۔

بھابی بولیں "اب تو لاؤ ہماری مٹھائی!"

مَیں کھویا ہُوا تھا اُس دھانی چُنری کے تصوّر میں ———!

"سُنتے ہو؟" وہ پھر بولیں۔

"مجھے کہا ہے؟" مَیں چونکا۔

"ہاں! ہاں! تمہیں کہا ہے۔ جاؤ اپنے کمرے میں نجمہ آ رہی ہیں۔"

ایسے لہجے سے تو بھیّا گھبرا جاتے تھے، بھلا میری حیثیت ہی کیا تھی۔ مَیں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کچھ دیر بعد کوئی بھابی جان کے کمرے میں داخل ہُوا۔

"آداب بھابی جان۔"

"آؤ نجمہ، آؤ بیٹھو۔ کہو جی تو لگ رہا ہے ہمارے شہر میں؟"

"ابھی تو نہیں۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"ابھی تم لوگ نئے نئے آئے ہو۔ کچھ واقفیّت بھی نہیں۔ دھیرے دھیرے

جب اِدھر اُدھر سے واقفیت ہو جائے گی تو جی خود بخود لگ جائے گا، اور جی لگانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ میل جول پیدا کرو۔"

"لیکن اِن دو بنگلوں کے سوا اور اِس طرف کوئی مکان ہی نہیں اور آدمی تو کُجا۔" نجمہ بولی۔

"یہ دو بنگلے ہی بہت ہیں۔ اگر تم اِنہی سے اچھّی طرح میل جول پیدا کر لو۔" بھابی پُرمعنی انداز میں "اچھّی طرح" پر زور دیتی ہُوئی بولیں۔

بھابی جان نے نوکر کو آواز دی اور بولیں "چائے کے تین پیالے لے آؤ۔"

کچھ دیر کے بعد پیالیاں کھنکیں اور نجمہ بولی "یہ تیسری کس کے لئے؟"

"ارے اگر کوئی پیتے پیتے آگیا تو اُسے اِنتظار کرنا پڑے گا اور بُرا بھی تو معلوم ہوتا ہے۔" بھابی نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد بھابی نے پُکارا "قمر صاحب! ذری یہاں تو آئیے چائے نہیں پیجئے گا؟"

"یہاں بھیج دیجئے۔ ہم ذرا کچھ لکھ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ بات اچھّی نہیں، ہم کہے دیتے ہیں اور ہاں، آؤ آج تمہارا ایک نئے صاحب سے تعارف کرائیں۔" بھابی جان نے پھر آواز دی۔

"اچھا، ہم ابھی آتے ہیں۔"

میں نے ڈرائنگ رُوم میں قدم رکھا تو ——————

نجمہ کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ کیسی تصور میں کھوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا آنچل سر سے ڈھلک گیا تھا اور گیسوؤں کی گھٹا کچھ ایسے انداز سے بکھری ہوئی تھی کہ میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ فضا میں ایک لطیف خوشبو کا تعطّر بکھر رہا تھا۔

نجمہ نے میری موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے جو دروازے کی طرف دیکھا تو میری نگاہیں ٹکرا گئیں، اُن نگاہوں سے، جن سے جوانی کی شراب چھلک رہی تھی۔ مَیں کوشش کرنے لگا اُس کی آنکھوں سے دِل میں اُترنے کی۔

"آپ ہیں مِس نجمہ" بھابی بولیں۔

مَیں نے کوئی جواب نہ دیا۔

بھابی بولیں "کیا بات ہے قمر صاحب، ابھی سے"

"مجھ سے کہا ہے بھابی تم نے؟"

"جی ہاں آپ سے کہا ہے"

اور مَیں شرما سا گیا۔ مَیں نے شرم کو مسکراہٹ میں دباتے ہوئے کہا "بے حد خوشی ہوئی آپ سے مِل کر"

بھابی پھر بولیں "آپ ہیں ہمارے قمر صاحب۔ بی۔اے کا امتحان دے چکے ہیں، نتیجے کا انتظار ہے۔ آپ بہت نازک مزاج ہیں۔ ہر بات کو ہمیشہ بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں۔ اگر آپ کی تعریف کرنے لگیں تو دیکھنا کہیں غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائیے" بھابی مارے ہنسی کے دوہری ہوئی جاتی تھیں اور

مَیں سوچ رہا تھا کہ یہ تعارف ہو رہا ہے یا سرِ بازار رُسوا کیا جا رہا ہوں۔

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔ مَیں نے بات کا رُخ بدلنے کو کہا۔

مَیں اور نجمہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مَیں تو چاہتا تھا کہ نجمہ میرے ساتھ بیٹھے، لیکن بھابی جان کو نہ جانے اِس میں کیا ہرج معلوم ہُوا، میرا ہاتھ پکڑتے ہُوئے کہا۔ "تم یہاں بیٹھو جی"۔

نجمہ نے پیالہ اپنے نازک سے ہونٹوں سے لگاتے ہُوئے نظریں چُرا کر میری طرف دیکھا، لیکن مَیں تو پہلے ہی دیکھ رہا تھا اُس کی طرف۔ میری نظریں اُس کی نظروں سے ٹکرا گئیں ——— وہ شرما گئی تھی اپنی اِس چوری پر۔ اور شاید خوش تھی اِس پر کہ مَیں نے اُسے چوری کرتے پکڑ لیا تھا۔

۲۹ رجُون ———

آج اتوار تھا۔ بھیّا کو بھی دفتر نہیں جانا تھا۔ اِس لئے سنیما جانے کا پروگرام پکّا ہو گیا۔ مَیں فلم پہلے ہی دیکھ آیا تھا۔ اِس لئے مَیں نے سنیما نہ جانے کے لئے بہانہ سوچا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور واقعی سر میں درد ہو بھی رہا تھا۔

دس بجے کا وقت تھا۔ مَیں بستر میں لیٹا سوچ رہا تھا کہ کاش کوئی میرا سر آہستہ آہستہ دبانے لگے اور پھر کیا ہو گا ——— ؟ مَیں ابھی اِتنا سوچ بھی نہ پایا تھا کہ بھابی چپل چٹ پٹاتی ہُوئی میرے کمرے میں داخل ہُوئیں اور بولیں۔

"کیوں جی، ابھی صبح نہیں ہوئی کیا؟"

"نہیں بھابی جان، یہ بات نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لاؤ میں سر داب دوں سنیما جانا ہے نا ——— تین بجے تک تو طبیعت ٹھیک ہو ہی جائے گی۔"

"ذرا وہ بام تو لیتے آیئے۔" بھابی نے بھیّا کو آواز دی۔

بھیّا بام لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور بولے "ارے، تمہارے بام لگانے اور سر دبانے سے کیا ہوگا؟ اب تو قمر کی شادی کر دو۔"

ہم دونوں بھائی آپس میں اتنے بے تکلف ہیں کہ کوئی ہماری باتیں سُنے تو حیرت کرے۔

"بھیّا، آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی سُوجھتا ہے۔ یہاں ہماری جان پر بنی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ڈاکٹر بُلوا دوں؟" بھیّا پریشانی کے لہجے میں بولے۔

"اجی نہیں، اتنی سی بات کے لئے ——— ڈاکٹر ——— میرا مطلب ہے ———"

"ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے قمر صاحب کہ مدّعا کیا ہے۔" بھیّا ہنستے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔

"پھر تو بھئی میں بھی کچھ نہ کر سکوں گی۔" بھابی اُٹھتی ہوئی بولیں،

ابھی وہ کمرے سے باہر گئی ہی تھیں کہ کوئی زینے پر آتا ہوا معلوم ہوا۔

"آداب بھابی جان۔"

"کہو نجمہ، اتنی سویرے تم کیسے چلی آئیں؟" بھابی بولیں۔

"بات یہ ہے بھابی جان کہ آج ہم سنیما جا رہے ہیں۔ سنا ہے پکچر بہت اچھی ہے۔ آپ سے پوچھنے آئی ہوں۔ آپ بھی چل رہی ہیں؟"

"ارے بھئی، یہ بھی خوب رہی۔ ہم تو پہلے ہی سنیما کا پروگرام بنا چکے ہیں لیکن نجمہ اب تو قمر صاحب اکڑ گئے ہیں۔ کہتے ہیں، سر میں درد ہے۔ اگر ہم گئے تو یہ کہیں گے کہ بھابی ہمیں بیمار چھوڑ کر چلی گئیں اور اگر کہتے ہیں کہ بھئی تم بھی چلو تو کہتے ہیں، طبیعت خراب ہے۔ عجب پریشانی ہے۔"

درحقیقت بھابی جان کو تو کوئی پریشانی نہ تھی۔ پریشانی تو اب مجھے ہو رہی تھی کہ اب کیسے کہوں کہ طبیعت ٹھیک ہے۔ مجھے ایک بات سوجھی۔

"بھابی ——— بھابی جان!" میں نے آواز دی۔

وہ میرے کمرے میں چلی آئیں، لیکن نجمہ نہیں آئی۔

وہ بولیں "۔ کیا ہے جی؟"

"دیکھو بھابی جان! ایک تو ہماری طبیعت خراب ہے اور اس پر طرہ یہ کہ تم ہم پر ناراض ہو رہی ہو۔ اچھا چلو تمہیں معاف فرما دیا۔ تم سنیما جاؤ، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"اور اگر تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو؟"

"ارے بھئی نہیں ہوتی۔ دراصل بات یوں ہے کہ ہم نے یہ پکچر دیکھ لی ہے۔"

"اچھّا تو تم ہمارا پروگرام بھی خراب کرنا چاہتے تھے۔ اب آئندہ کے لئے تمہارا اعتبار جاتا رہا۔" بھابی بولیں۔

"ہمارا اعتبار تم پر قائم کب تھا!" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اور نجمہ کمرے کے باہر کھلکھلا کر ہنس دی اور دوڑتی ہوئی زینے سے اُتر گئی۔ میں سوچنے لگا، اگر نجمہ بھی سنیما چلی گئی تو پھر تو سکیم فیل ہے۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نجمہ کا نوکر آیا اور بھابی جان سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ "بی بی سنیما نہیں جائیں گی۔ اُن کے ابّا جان کو کسی دوست نے چائے پر بُلایا ہے اور مجھے اپنی سکیم کامیاب ہوتی نظر آنے لگی۔ یُونہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

"قمر صاحب دو بج رہے ہیں، چلنا ہو تو چلیے چلو، ورنہ ہم تو جا رہے ہیں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔" بھابی نے مجھے جگاتے ہُوئے کہا۔

"آپ جائیے بھابی جان، اور دیکھئے ہمارے لئے مٹھائی لیتے آئیے گا۔" میں نے انگڑائی لیتے ہُوئے کہا۔

"اور ہماری اُس روز کی مٹھائی اور نہ جانے کتنی اور باتوں کی مٹھائی ہمارا حق ہے قمر صاحب۔" بھابی آنکھیں مٹکاتی ہُوئی بولیں۔

"بھابی پھر لگیں تم بچوں کی سی باتیں کرنے!" میں نے بھابی کو مات

دینے کے لئے کہا۔

اِتنے میں بھیّا کمرے میں آ گئے اور بھابی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔
"بھئی قمر، تمہاری بھابی دُودھ پیتی بچّی ہیں۔ ایسی ہی باتیں کریں گی۔"

مَیں شرما کر رہ گیا۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔

"گھر کا خیال رکھئے گا۔ دیکھنا کوئی اندر نہ گھُس آئے۔" یہ کہتے ہُوئے بھیّا بھابی کو لئے ہُوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ساڑھے تین بج چُکے تھے، لیکن نجمہ نہیں آئی تھی۔ نہ جانے کیا بات ہوگئی ہوگی۔ مَیں سوچنے لگا ——— کہیں اُن کے ابّا جان نے سنیما جانے کا پھر تو ارادہ نہیں کر لیا؟ مَیں اُس کھڑکی میں جا کھڑا ہُوا جو نجمہ کے بنگلے کی طرف کھُلتی تھی۔ نجمہ کھڑکی میں کھڑی میرے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے کھڑکی میں کھڑے دیکھ کر نجمہ مُسکرا دی۔ مَیں نے نجمہ کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور اُس نے سر کے اشارے سے "ہاں" میں جواب دیا اور کھڑکی بند کر کے چلی گئی۔ مَیں پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر بعد اُوپر آنے کی آہٹ سُنائی دی۔

"مَیں اندر آسکتی ہُوں؟" نجمہ کمرے کے باہر سے بولی۔

"جی ہاں ضرور!" مَیں نے جواب دیا۔

وہ میرے پلنگ کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

"نجمہ، دیکھو مجھے اِس طرح کا تکلّف پسند نہیں۔ بھلا اِس میں پُوچھنے

کی کیا بات ہے ؟ تم جب چاہو آؤ اور دیکھو تم اب تک کھڑی ہو۔" میں نے نوکر کو آواز دی۔

"دیکھو وہ صوفہ ہمارے پلنگ کے قریب کر دو اور دو کپ چائے لاؤ۔"

"نجمہ، کچھ کھاؤ گی بھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ شرماتی ہوئی بولی۔

"کیوں نہیں، یہ چائے کا وقت ہے۔" اور میں نے نوکر کو چائے کا سامان لانے کے لئے بھیج دیا۔

"نجمہ، دیکھو ابھی دو ایک دن میں نتیجہ نکل رہا ہے اور میں واپس دہلی چلا جاؤں گا۔ تم دل کی بات زبان پر نہیں لاتیں اور نہ میں — کہیں دل کی باتیں دل ہی میں نہ رہ جائیں — ایک بات بتاؤ گی؟"

"جی۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"نجمہ، مجھے تم سے محبت ہے۔ اگر میں بھیّا سے کہہ دوں کہ میں — میرا مطلب ہے کہ — کہ تم بھی ..... ؟"

نجمہ نظریں جھکائے اپنے آنچل کا کنارا بہت ہی پیاری ادا سے مروڑنے لگی۔

میں نے پھر کہا۔ "نجمہ، میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا —"

نجمہ نے سر کو کچھ اس طرح سے جنبش دی، جس کے معنی "ہاں" تھے۔

میں نے پھر کہا "یوں نہیں، کچھ زبان سے بھی تو بولو۔ یہ گونگوں کی سی باتیں ہمیں پسند نہیں۔"

ابھی مجھے جواب کا انتظار ہی تھا کہ نوکر چائے لے آیا۔

"نجمہ چائے نہیں پلاؤ گی؟"

"جی مطلب ——؟" نجمہ نے بالکل اس طرح کہا جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔ شاید وہ کچھ سوچنے میں محو تھی۔

"مطلب یہ سرکار کہ چائے بنائیے۔ پھر شاید کبھی آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی نصیب نہ ہو۔"

"ایسا نہ کہئے۔ ایسی باتوں سے مجھے بہت دُکھ ....." نجمہ چائے بناتی ہوئی بولی۔

"غلطی ہوئی۔ ہمیں تو اب پتہ چلا ہے کہ آپ خود ہی نازک نہیں، آپ کا مزاج بھی نازک ہے۔"

نجمہ پھر شرمانے لگی —— "اچھا یہ بتائیے آپ دہلی کب جا رہے ہیں؟" نجمہ نے بہت حسرت سے پوچھا۔

"دیکھئے، پرسوں تو نتیجہ نکل رہا ہے اور چوتھے مجھے ہر حالت میں جانا ہوگا۔ کیونکہ ابّا جان کا خط آیا تھا کہ نتیجہ نکلتے ہی چلے آؤ۔"

وہ مایوسیوں کے بادلوں کے تصوّر سے گھبرا گئی۔

"آپ کے سر میں درد تھا نا۔ اب کیسا ہے؟" نجمہ بولی اور میرے جواب

دینے سے پہلے ہی اُس نے اُٹھ کر اپنا نازک ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دیا۔ وہ میرے بہت قریب ہو گئی۔ اُس کی سانسیں میری سانسوں سے ٹکرا گئیں ـــــــــ

"پانچ بجنے کو ہیں۔ اب میں چلتی ہوں:"

میں نجمہ کو چھوڑنے دروازے تک آیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس کی لانبی لانبی پلکیں جُھک گئیں۔ رخسار گلابی ہو گئے

۳۰ / جُون ـــــــــ

آج میں بہت دیر تک سوتا رہا ـــــــــ

"اُٹھیے ناقمر صاحب" بھابی مجھے جگاتی ہوئی بولیں۔ آنکھ کھلتے ہی جو میری نظر کلاک پر پڑی تو دیکھا ابھی صرف آٹھ بجے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"بھابی جان، اتنی جلدی جگانے کے معنے؟ ایک تو ہمیں نتیجے کا فکر ہے اور دُوسرے ہمارا دن بھی تو نہیں گزرتا:"

بھابی مسکرانے لگیں۔ سوچا ایک اور چوٹ کروں۔

"بھابی، تمہیں تو ہر حالت میں جلد ہی اُٹھنا پڑتا ہے۔ بھیا جو اُٹھ جاتے ہیں اور تم ہمیں بھی سونے نہیں دیتیں:"

"حشمت قمر ـــــــــ اب تو حد ہو گئی:" بھابی شرما گئیں ـــــــــ

"اچھا یہ بتاؤ قمر صاحب کل ہمارے سینما جانے کے بعد یہاں کون

آیا تھا؟" بھابی آنکھیں مٹکاتی ہوئی بولیں۔

"کوئی بھی تو نہیں ——"

"کوئی کیسے نہیں، صاف صاف کہو کہ نجمہ آئی تھی اور ——

کہو تو کہہ دوں"

"بھابی جان دراصل بات یہ ہے کہ میں ——"

"ہاں! ہاں! کہو کہ میں ——"

"بھابی جان، میں نجمہ سے شادی کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو"

"اگر نجمہ کے والد نہ مانے تو ——"

"مانیں گے کیسے نہیں۔ ہم کوئی فقیر تو نہیں ہیں، جن کے ہاں اُن کی صاحبزادی بھوکی پیاسی رہے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نجمہ بھی تو چاہتی ہے"

"دیکھئے قمر صاحب، میں اُن سے کہلوائے دیتی ہوں، لیکن ہاں یا نا تو نجمہ کے ابا پر ہے" بھابی نے یوں کہا، جیسے کہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ ہو۔

"بھابی جان صرف کہلوانے سے تو کام نہ چلے گا۔ اگر سب ٹھیک کروا دو تو جانیں"

اور بھابی کچھ سوچتی ہوئی میرے کمرے سے چلی گئیں۔

نوکر کافی لے آیا۔ میں نے ابھی پیالہ لبوں سے لگایا ہی تھا کہ نجمہ آ گئی۔

"آؤ نجمہ، بیٹھو۔" میں نے کہا۔

وہ بیٹھ گئی لیکن آنکھیں شرم سے زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔

"نجمہ کافی پیو گی؟" میں نے پوچھا۔

"جی، میں تو چائے پی کر آئی ہوں۔" اس نے لجاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو کیا ہوا۔ کافی بھی پی لو۔" میں نے بہت ہی اصرار بھرے لہجے میں کہا۔

وہ کچھ نہ بولی۔

"لیکن ایک شرط اور بھی ہے۔"

"وہ کیا ——؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ اسی پیالے سے پیو، جس سے ہم پی رہے ہیں۔"

"جیسا آپ کہیں۔ لیکن آپ بھی ایسا کریں گے اگر میں کہوں؟" نجمہ نے بہت معصومیت سے پوچھا۔

"ارے میں تو چاہتا ہی تھا کہ تم ایسا کہو۔" اور میں نے اپنا پیالہ نجمہ کو دے دیا۔ میں نے ایک اور پیالہ منگوایا۔ اس مرتبہ میں نے نجمہ کے ہونٹوں کا لمس اس کے لبوں سے لگے ہوئے پیالے میں محسوس کیا۔

"نجمہ، تم اتنی دور کیوں بیٹھی ہو؟ میرے نزدیک آجاؤ نا۔"

"اگر کوئی آگیا تو؟"

"تو کیا ہوگا۔ میں نے بھابی سے تو کہہ ہی دیا ہے اور بھیا کو تو بھابی نے بتا ہی دیا ہوگا اور تمہارے سوا کوئی ہمارے یہاں آتا ہی نہیں۔"

اور نجمہ میرے قریب ہو گئی۔

"نجمہ، آج تم کچھ اداس نظر آ رہی ہو۔"

نجمہ نے بھی سوال کر دیا، لیکن جو درحقیقت جواب تھا۔

"سچ آپ کل جا رہے ہیں؟"

"ہاں نجمہ، میں کل دہلی جا رہا ہوں۔ آج رات لاہور نتیجہ نکلے گا اور کل شام کی گاڑی سے میں چلا جاؤں گا، لیکن نجمہ تم گھبراؤ نہیں۔ آج شام بھیا کے آتے ہی میں انہیں تمہارے ابا جان کے پاس بھیجوں گا ——— اور انشاء اللہ ہماری شادی کی بات طے ہو ہی جائے گی۔"

شادی کا نام لیتے ہی نجمہ پھر شرما گئی اور میں نے نجمہ کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ نجمہ عجب بے قراری کے عالم میں ایک سہمے ہوئے پرندے کی مانند سمٹ کر میرے سینے سے لگ گئی۔

باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور نجمہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ دیکھا تو بھابی جان تشریف لائی تھیں۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولیں۔

"ارے نجمہ، تم کب آئیں؟ مجھے تو پتہ ہی نہ لگا۔"

نجمہ گھبرا گئی۔ یوں تو بھابی سب جانتی تھیں، لیکن کچھ جواب تو دینا ہی تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔

"ابھی ابھی بس آ کر بیٹھی ہی تھیں۔"

"اجی قمر صاحب، ہم سب سمجھتے ہیں! یہ دوسرا پیالہ کس کا ہے؟ اور

اگر تم کہو کہ ابھی آئی ہیں تو قمر صاحب، کافی بھی کوئی پانی تو تھا نہیں، جو منہ لگایا اور پی گئی ہوں گی ——— کیوں نجمہ؟"

"بھابی، تم سب جانتی ہو، لیکن پھر بھی یوں ہی پریشان کرنا چاہتی ہو۔"

اور نجمہ بھاگ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

"بھابی، تم بہت تنگ کرتی ہو۔ تمہیں تو معلوم نہیں کہ فراق کیا ہوتا ہے۔ بھیّا جو یہاں ہیں اور تم ہمیں بھی بات نہیں کرنے دیتیں۔"

بھابی میرے منہ پر ایک ہلکی سی چپت لگا کر کمرے سے چلی گئیں۔

شام کو بھیّا لوٹے تو میں نے بھابی کو ان سے ذکر کرنے کے لئے کہا۔ بھابی نے بھیّا کو نجمہ کے ابا کے پاس جانے کے لئے منا لیا۔ لیکن بھیّا کا جانا فضول ہوا۔ نجمہ کے ابا دن ہی کو دورے پر بمبئی چلے گئے تھے۔ بھیّا نے واپس آکر بھابی سے کہا۔ "تم قمر کو سمجھا دو کہ ہم پوری پوری کوشش کریں گے کہ تمہاری شادی نجمہ سے ہو جائے۔ ہم خود ہی قمر کو سمجھا دیتے لیکن وہ ہم سے شرمائے گا۔" میں نے یہ سب کچھ پہلے ہی سن لیا تھا۔ بھابی میرے کمرے میں آئیں، لیکن انہیں کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ میں نے اشارے سے سمجھا دیا کہ میں نے سن لیا ہے۔ تم جاؤ۔

کتنی اندھیری رات ہے! میں پلنگ پر پڑا سوچ رہا تھا۔ بارش یوں برس رہی تھی، جیسے پھر کبھی نہ برسے گی۔ میں مایوسیوں کے بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ سوچ رہا تھا اپنی محبت کا انجام اور جب میں انجام کے نزدیک

ہونے لگتا تو نتیجے کا خیال ہر ایک نقش کو میرے ذہن سے مٹا دیتا۔ باہر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور چاپ دروازے تک آ کر ختم ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ایک دھیمی سی آواز آئی "آجی"۔ میں نے دروازہ کھولا تو نجمہ کھڑی تھی۔

"نجمہ، تم ——— !؟" حیرت میں میرے منہ سے نکل گیا۔

"آپ کہیں تو واپس چلی جاؤں"۔ نجمہ نے شکوے کے لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں نجمہ، ایسا کس نے کہا ہے؟ اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو گی کہ تم آئی ہو"۔

"چلو ہٹو جھوٹے کہیں کے۔ اپنی مرضی سے آئی ہوں، جب بھی آئی ہوں۔ آپ نے تو ایک مرتبہ بھی نہیں بلایا"۔

"نجمہ تم خود آ گئیں یا میں نے بلا لیا، ایک ہی تو بات ہے شکوہ کا ہے کا"۔ اور میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

نجمہ آج بھی دھانی چنری اوڑھے ہوئے تھی، وہ اپنی بھیگی ہوئی چنری کو نچوڑ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا ——— میں سوچ رہا تھا کہ نجمہ آج شاید چلی آئی ہے وہ سب کچھ لٹانے جو اس کے پاس باقی رہ گیا ہے۔ نجمہ مجھے کتنا چاہتی ہے؟ یہ احساس ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا: جیسے نجمہ کا دل ایک اتھاہ سمندر ہو اور میں اس کی گہرائی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اس کی طرف امنگ بھری نظروں سے دیکھ

کر کہا۔ "نجمہ!"

"جی۔" اُس نے جواب دیا۔

میں نجمہ کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہوں۔ میں نے نجمہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے نجمہ نے پی لی ہو۔ جوانی کی شراب، اُمنگوں کی شراب اور میں نے بڑھ کر نجمہ کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا ——

یکم جولائی ——

آج صبح جب آنکھ کھلی تو بھیّا کو بھابی سے کہتے سُنا۔

"دیکھو قمر کا فرسٹ ڈویژن!" اور بھابی کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "میرا قمر!!"

بھابی میرے کمرے میں آئیں اور بولیں "۔ قمر، تمہارا فرسٹ ڈویژن آیا ہے۔"

"تو کیا ہُوا؟" میں نے انتہائی غم کے لہجے میں جواب دیا۔

"ارے قمر، اتنی خوشی کی بات ہے اور تم اتنے غمگین ہو، آخر کوئی بات بھی تو ہو؟"

اِتنے میں بھیّا بھی کمرے میں آگئے اور کچھ بولنے ہی کو تھے کہ بھابی بولیں "۔ اجی، یہ تو نہ جانے آج کیسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ اِن سے پُوچھیے تو بھلا غم کاہے کا ہے؟"

بھیّا بولے۔ "قمر، ہم سمجھتے ہیں اور تم سے وعدہ بھی کرتے ہیں کہ تمہاری شادی نجمہ سے طے کروانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے ——— یہ لو ہمارا انعام اور کھلاؤ مٹھائی ———" اور یوں کہتے ہوئے بھیّا نے سَو روپیہ کا ایک نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔

مَیں نے نوکر کو آواز دی، لیکن بھیّا بولے۔

"قمر، تم خود لاؤ اور ہاں وہ نیا سُوٹ پہن کر جانا" مجھے مجبُوراً جانا ہی پڑا۔ دُکان پر کھڑے ہوئے خیال آیا کہ نجمہ کے لئے بھی مٹھائی لیتا چلوں۔

جب واپسی پر نجمہ کے یہاں پُہنچا تو نجمہ ایک درد بھرا گیت گا رہی تھی ———

پردیس چلے ہو بھُول نہ جانا

"نجمہ، یہ گیت نہ گاؤ۔ مَیں تمہیں بھُول نہیں سکتا لیکن ایسے گیت مجھے...... یہ لو مٹھائی، میرا فرسٹ ڈویژن آیا ہے۔"

"مُبارک ہو" اور نجمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ مَیں اُسے یُوں روتے نہ دیکھ سکا اور اِتنا کہہ کر لَوٹ آیا ———

"اگر ہو سکے تو ہمارے یہاں ضرور آنا۔ مَیں آج رات کی گاڑی سے واپس دہلی جا رہا ہُوں ——— اور اسٹیشن تو شاید تم نہ جا سکو۔"

جب گھر پُہنچا تو دیکھا۔ بھابی قہقہے بکھیر رہی تھیں۔ بھیّا بھابی سے بھی زیادہ خوش تھے، اور مَیں اِن سے بھی زیادہ خوش ہوتا اگر مجھے جُدائی کا غم نہ ہوتا۔

ہم شام کی چائے پی رہے تھے کہ نجمہ آ گئی اور دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ "اندر آ جاؤ"۔ میں نے کہا لیکن وہ اُسی طرح وہیں کھڑی رہی۔ میں اُس کا مطلب سمجھ گیا اور باہر اُٹھ آیا۔

"نجمہ، اگر خدا کو منظور ہوا تو ہم جنم جنم کے ساتھی ہو جائیں گے۔ تم جی مت چھوڑو۔"

نجمہ کی آنکھوں سے آنسو یوں بہہ رہے تھے جیسے کسی نے موتیوں کی مالا کا دھاگہ توڑ دیا ہو۔ وہ میرے روکنے سے پہلے ہی الوداع کہہ کر چلی گئی۔

"اب تو آٹھ بج رہے ہیں۔ جلدی کرو قمر" اور بھابی نے نوکر کو بلوا کر میرا سامان کار میں رکھوا دیا۔ میں بھیّا اور بھابی جب بنگلے سے باہر نکلے تو میری نظر گھوم کر نجمہ کے کمرے کی کھڑکی پر جا پڑی۔ نجمہ کھڑکی میں کھڑی جیسے سسک رہی تھی ——— "پردیس چلے ہو بھول نہ جانا"۔

۱۰ رجولائی ———

آج بھیّا کا خط آیا ہے کہ "نجمہ کے ابّا نجمہ کی شادی لمبئی میں طے کر آئے ہیں۔ اب تو کچھ نہ ہو سکے گا۔"

اب میرے لئے اِس ڈائری کے اوراق کی قیمت ایک کھوٹے روپے سی ہے جنہیں میں تنہائی میں اکثر اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا کرتا ہوں +

سکینڈل پوئنٹ پر

مال روڈ کسی عروسِ نو کی طرح جوان و پُر رونق تھی سکینڈل پوئنٹ پر کھڑا وہ سوچ رہا تھا کہ گیٹی تھیٹر تک ہو آئے یا کافی ہاؤس تک گھوم آئے؟ اُس کے ذہن میں اِنتشار تھا، اور بھوک، پیاس سے اُس کے ہونٹوں پہ پپڑیاں جم رہی تھیں۔ وہ جنگلے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

جی بہلانے کے لئے اُس نے بیڑی سلگا لی۔ اُس کی آنکھوں میں اپنے گردوپیش دیکھنے کی حس پیدا ہوئی۔ سامنے ایک عظیم شخصیت کا مجسمہ تھا۔ جہاں اُس عظیم شخصیت کا زمانہ لکھا تھا، کسی سنیما کے مالک نے ایک انگریزی فلم کا پوسٹر چسپاں کروا دیا تھا۔ میریا مونٹز اپنا گاؤن ہاتھوں سے اونچا کئے ہوئے اپنی رانوں کی نمائش کر رہی تھی۔ جس صنّاع نے یہ مجسّمہ بنایا تھا اُس نے نہ جانے کیوں مجسّمے کا ایک ہاتھ سامنے بڑھا کر ایک اُنگلی کھڑی

کر دی تھی، جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ خدا ایک ہے، ایک ہو کر رہو ——
اُس کے قریب کھڑے ہوئے ایک کالجیئٹ نے مسکرا کر اپنے ساتھی سے کہا ——

"یار اتنی ہیں۔ یہ بھی ایک مانگ رہا ہے اور ہم بھی صرف ایک ہی تو مانگتے ہیں۔ لیکن، وائے ری قسمت!"

اُس کی نگاہیں میریا مونٹز کی رانوں کے گرد گھوم گئیں۔ اُس کے جی میں آئی کہ ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹوں سے گلا تر کر کے بلند آواز میں نعرہ لگائے۔ "ہندوستان زندہ باد! آج کے بچے کل کے باپ ہیں، یہ قوموں کا مستقبل ہوتے ہیں، انہیں بہترین تعلیم دو، تاکہ یہ ملک کی ترقی میں مدد دیں۔" پھر وہ سوچنے لگا، نہیں، اِس سے بہتر تو یہ تھا کہ اِن لڑکوں کے باپ اِن کی شادیاں زرخیز بیویوں سے کر دیتے، جو ہر سال بچے جنتیں تاکہ یہ ایسی عظیم شخصیتوں کے لئے عورتیں تو نہ ڈھونڈتے اور پھر شاید اُن درجنوں بچوں میں کوئی ایسا بھی پیدا ہو جاتا جو سڑک کے کنارے لگے ہوئے برقی قمقموں تلے بیٹھ کر کتابوں کی سیاہی چوستا اور اس شخصیت کی عظمت تک پہنچ جاتا۔ پھر اُسے ایک دم احساس ہوا کہ اُسے خاموش رہنا چاہیئے، چپ۔ ورنہ، اِن کالجیئٹ لڑکوں کے سیٹھ باپ اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پوچھ لیں گے کہ اِس عظیم شخصیت کے شجرۂ نسب سے اُس کا کہاں تک تعلق ہے۔

☆ ☆ ☆

نیلی پگڑی :- "ماسٹر تارا سنگھ نے پنجابی بولنے والے لوگوں کا علیحدہ صوبہ بنانے کو کہا ہے"۔

کشتی نما ٹوپی :- "مگر اس صوبے میں پنجابی لکھی تو گورمکھی میں جائے گی؟"

نیلی پگڑی :- "مگر ہوگی، تو پنجابی"۔

کشتی نما ٹوپی :- "لیکن، بھارت کی زبان تو ہندی ہے؟"

لال پگڑی :- "اردو نستعلیق میں لکھ لو پنجابی"۔

کشتی نما ٹوپی :- "اردو تو ہم نے پنجاب میں بند کروا دی ہے"۔

لال پگڑی :- "ہندی آتی ہے آپ کو؟"

کشتی نما ٹوپی :- "مَیں سیکھ رہا ہوں"۔

لال پگڑی :- "اردو آتی ہے آپ کو؟"

کشتی نما ٹوپی :- "اردو میں تو مَیں شعر کہا کرتا تھا"۔

لال پگڑی :- "اب کیا ہو گیا ہے؟"

کشتی نما ٹوپی :- "اب تو جنتا کی مانگ ہے اور ہم نے تو جنتا کے لئے، MASSES کے لئے جیلیں تک کاٹی ہیں"۔

لال پگڑی :- "لیکن، جنتا تو ہندی سے زیادہ روٹی مانگتی ہے؟"

کشتی نما ٹوپی :- "اس کا بھی انتظام ہو رہا ہے۔ کسانوں سے زیادہ اگاؤ کی اپیلیں ہو رہی ہیں اور اُن لوگوں کے لئے جو مہاجر ہیں گورنمنٹ نے مکان بنوا دئے ہیں۔ صرف 16,000 روپے میں

۱۰۰ سال کی LEASE پر مکان مل سکتے ہیں۔"

لال پگڑی :۔"مگر 16,000 پر تو آپ کے رشتہ دار ہی مکان لے سکیں گے۔ یہ غریب تو جھونپڑیاں مانگتے ہیں سر چھپانے کے لئے:"

کشتی نما ٹوپی :۔" اِن کے لئے رفیوجی کیمپ ہیں۔"

لال پگڑی :۔ آپ کا بھی کوئی رشتہ دار، کسی کیمپ میں ہے ؟

کشتی نما ٹوپی :۔" ہی ــــ ہی ــــ ہی !!! اَجی، ہمیں تو، اِس خطرے کا پہلے ہی احساس تھا اور ہم نے اپنے سب رِشتہ داروں کو پہلے ہی بُلا لیا تھا اور وہ ہمارے دوست تھے نا بچارے خان صاحب عبدالمجید، اُن سے اپنی جائیداد کا "پہلے ہی" تبادلہ کروا لیا تھا۔ خان صاحب، یُوں تھے تو لیگی مگر صاحب ایسے وقت میں اِنسان ہی ایک دُوسرے کے کام آتا ہے۔"

لال پگڑی :۔" مگر یہ لوگ جو کیمپوں، گلی کوچوں میں سٹر رہے ہیں، یہ تو اپنی جھونپڑیوں کا تبادلہ نہ کر سکے ــــ!"

نیلی پگڑی :۔" صاحب! بات تو مہندی، گور مکھی کی ہو رہی تھی!"

کشتی نما ٹوپی :۔" جی، ہاں! ــــ جی، ہاں!!"

لال پگڑی :۔" مَیں اِس لئے کہہ رہا تھا کہ سُننے میں آیا ہے کہ اِن لوگوں کی جھونپڑیوں کا تبادلہ ہونے والا ہے۔"

کشتی نما ٹوپی :۔" ہیں!"

نیلی پگڑی :۔ "اجی نہیں، گپ ہے۔ اب ایسا کہاں ہوگا؟"
لال پگڑی :۔ "اجی ہو رہا ہے! اِن کی جھونپڑیوں کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ اِن کی جھونپڑیوں کا تبادلہ آپ کی کوٹھیوں سے ہونے والا ہے!!"

ریچ پر لاؤڈ سپیکر کی آواز گونج رہی تھی ——— "کمیونسٹ فوجیں ہانگ کانگ کی جانب بڑھ رہی ہیں ———"

٭ ٭ ٭

"لالہ جی، جے ہند!"

ایک کھدر پوش نے دوسرے کو آوازہ کسنے کے انداز میں مخاطب کیا۔ دوسرے کے ساتھ اُس کی بیوی بھی تھی۔ اُس کی بیوی، جس کے بغیر بانہوں کے بلاؤز میں سے ایک اینگل سے اُس کی چھاتی نیم عُریاں سی ہو رہی تھی۔ بلاؤز چولی نُما سا تھا جیسی چولیاں دہلی اور یُوپی میں مزدُور عورتیں پہنتی ہیں۔ سامنے سے پیٹ ننگا اور پیچھے سے تمام پیٹھ ننگی ———

"آخاہ، آپ، لالہ جی!" ہاتھ آگے کو بڑھ گیا۔ لالہ جی کی بیوی نے بھی مُسکراتے ہُوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"کب تشریف لائے؟" ہاتھ جھٹکتے ہوئے دُوسرے نے پُوچھا۔

"کل آیا تھا۔ وہ ہمارے دوست ہیں نا سیٹھ مانک چند۔ وہ اُس سٹیل سکینڈل والے کیس میں ..... اُن کی ضمانت کا بندوبست کرنا تھا۔"

"کہاں ٹھہرے ہیں آپ؟"

"گرینڈ ہوٹل میں ــــــ"

"آپ ہمارے یہاں ٹھہرتے!"

"تکلف کرتے ہیں یہ ہمیشہ" شرمیتی جی نے مسکراتے ہوئے کہا اور چھاتی سے ڈھلکا ہوا ساڑی کا آنچل ڈھلکا رہنے دیا۔

"اجی، یہ بات نہیں، وقت ہی کچھ تھوڑا تھا۔"

"خیر، کب تک واپس جانے کا ارادہ ہے؟"

"سیٹ ریزرو ہو گئی ہے۔ آج رات کی گاڑی سے واپس انبالہ جا رہا ہوں، وہاں مجھے ایک جلسے میں تقریر کرنی ہے۔"

"آیئے ڈیوکوز میں بیٹھتے ہیں۔ کچھ بات چیت ہو گی پھر نہ جانے آپ کب تشریف لائیں گے۔"

"اجی کاروبار ہی ایسا ہے اور پھر آپ میری سیاسی مصروفیات کو تو جانتے ہی ہیں" انہوں نے ڈیوکوز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ڈیوکوز کے دروازے سے جب سیٹھ جی، لالہ جی کی بیوی کی کمر کو سہارا دے کر اندر داخل ہو رہے تھے تو ایک بھکارن نے ان کی چپل پر سر رکھ دیا۔ بھکارن کے تار تار کپڑوں سے اس کا بیمار جسم، حریص نگاہوں سے بے نیاز ہو کر جھانک رہا تھا۔

"بابو جی، مالک!! صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔"

اور پھر اپنی پھٹی ہوئی شلوار کے چاک دکھا کر ——

"بابُوجی! سردی سے جان نکل رہی ہے۔ کپڑے نہیں ہیں"۔

"بابوجی" نے پاؤں پیچھے ہٹا لیا۔ چپل پہن لینے سے کوئی اُن کی عظمت، اُن کا وقار تھوڑا ہی گھٹ گیا تھا، جو وہ ایک بھکارن کے سر کو اپنے پاؤں سے چھُونے دیتے ——؟

لالہ جی کی بیوی کی گرم گرم پُشت پر اب تک اُن کا ہاتھ ٹِکا ہُوا تھا۔ اُس میٹھی میٹھی گرمی کے متعلق سوچتے ہوئے وہ زوردار لہجے میں بولے۔

"تمہیں سردی لگتی ہے ——؟ یہ دیکھو! میم صاحب کو، اِن کے بازُو ننگے ہیں اور اِس جارجٹ کی ساری میں بھی اِنہیں سردی نہیں لگتی۔ تُم نے مانگنے کو پیشہ بنا لیا ہے، ذلیل"۔

اور وہ زینہ پر چڑھنے لگے۔ اُن کے ذہن میں سٹیل سکینڈل گھُوم رہا تھا۔ مارکیٹ کی قیمتیں، کل کرنے والی تقریر کی کڑیاں، جنتا، بھُوک، شرنارتھی، مہاتما گاندھی کا سندیس ——!

کرسی کے قریب پُہنچ کر اُنہوں نے شریمتی جی کی ننگی پیٹھ پر ہاتھ ذرا زور سے دبا کر پھسلا دیا۔ شریمتی جی مُسکراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں اور پھر مُسکراہٹوں میں پُوچھنے لگیں۔

"میں نے کہا، وہ لوہے کے "بزنس" میں آپ کو کتنا بچ گیا تھا؟"

"ابھی صرف چھ لاکھ۔ زیادہ بچ جاتا، لیکن "قیمت" حاصل نہ ہو سکی"۔

باہر سڑک پر ضمیمہ بیچنے والا چلّا رہا تھا۔

"کلکتے میں بھوکے مہاجروں نے دو کانیں لوٹ لیں۔ پولیس نے گولی چلادی، پچاس آدمی ہلاک!"

* * *

ریج پر لاؤڈ سپیکر گونج رہا تھا۔ ایک آنریبل منسٹر تقریر فرما رہے تھے۔

"آزادی کس نے جیتی ہے؟ — آزادی PUBLIC OPINION سے ملی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ آزادی ہمارے جیلوں میں جانے سے مل گئی"۔

اور لاؤڈ سپیکر تالیاں پیٹنے کی گونج اُگل رہا تھا۔

"سوشلسٹ خیالات ہیں!" — ایک نوجوان دُوسرے کے قریب ہوتے ہُوئے بولا۔

"اپنی ناکامیابی کا اعتراف ہے۔ ایک نیا حربہ ہے عوام کو جیتنے کا۔" دُوسرے نے جواب دیا۔

"ایثار و قربانی اس کا نام ہے جیلوں میں سالوں سڑنے کے بعد بھی یہ وطن کے پروانے کہتے ہیں کہ آزادی ان کی لائی ہوئی نہیں۔" ایک کشتی نما ٹوپی، دُوسرے کے قریب ہو گئی۔

"سب بکواس ہے! — بکواس!! — آزادی انہوں نے خرید کر دی تھی، اپنے خُون کے عوض، جو جیلوں میں سڑ سڑ کر مر گئے — جو جیلوں سے دق لئے ہوئے لوٹے — اور آزاد وہ ہیں جو جیلوں میں

عوام کی کہانیاں لکھتے رہے۔"

"آپ خاموش نہ رہیں گے؟" کشتی نما ٹوپی نے اُس نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے تنبیہ کی۔

"تمہیں یاد ہے ۴۲ء کے شہید؟ رام پرشاد بسمل؟ ــــ آزاد؟ بھگت سنگھ؟؟ نہیں، وہ تو ایندھن تھے اور یہ تقریریں شاید اِس لئے ہو رہی ہیں کہ یہ لوگ باقی ہیں۔"

"مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔" دُوسری تنبیہ ہوئی۔

"میں پُوچھتا ہوں تمہیں کیا حق ہے اُس شہید کا مذاق اُڑانے کا، یہ سفید ٹوپیاں پہن کر اُس شہیدِ اعظم کا مذاق اُڑانے کا؟ شاید تُمہیں یہ یاد نہیں کہ اِس مُلک میں سب سیٹھ نہیں ہیں۔ یہ امریکہ نہیں، ہندوستان ہے جہاں ۵۳ کروڑ عوام غُربت و افلاس کا شکار ہیں، جنہیں دو وقت رُوکھی سُوکھی روٹی بھی میسّر نہیں آتی۔ یہ ٹوپی اُتار دو۔ پھر اِن عوام کو کُچلو، پھر دیکھنا اِن کے آہنی ہاتھ کتنی سُرعت کے ساتھ تمہارے گلے تک پہنچ جائیں گے۔"

"پاگل معلوم ہوتا ہے!" دُوسری کشتی نما ٹوپی نے کہا۔

"ہاں، ہاں!! اِس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ تُم وہی لوگ ہو جنہوں نے ۴۲ء میں کتنے جوان سینے گولیوں سے چھلنی کروا دئیے تھے ــــــ"

* * *

لاؤڈ سپیکر گونج رہا تھا ــــــ

"اب ہم سب کو متحد ہو کر اُن عناصر کے خلاف جنگ کرنی ہے جو مُلک میں امن قائم کرنے میں حائل ہو رہے ہیں۔"

"ایک اور نیا حربہ! یہاں سب کھدّر پوش ہونے چاہئیں ——— کھدّر پہنو، اوڑھو اور بلیک مارکیٹ کرو، اِس میں کوئی بُرائی نہیں۔ یہ وطن، یہ مُلک اُس کا ہے، جس نے کھدّر پہن رکھا ہو اور جس کے بدن پہ کپڑا بھی نہ ہو اُسے چیخنے چِلّانے کا کوئی حق نہیں۔ وہ صرف کھدّر پوش آقاؤں کے ہاتھوں سے اُن کے دہن میں جاتے ہُوئے نوالوں کو دیکھتا رہے ———"

پولیس کا انسپکٹر نوجوان کو گھسیٹتے ہُوئے لے جا رہا تھا۔ ایک اور کا اضافہ ہو رہا تھا کھدّر ہنس رہا تھا اور ہنس رہی تھی بلیک مارکیٹ!

لاؤڈ سپیکر گونج رہا تھا ———

"حکومت ایسے عناصر کے خلاف زبردست ایکشن لے رہی ہے جو امن کو برہم کر رہے ہیں۔"

٭ ٭ ٭

بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے ——— اور سکینڈل پوئنٹ پر لگے ہُوئے دُودھیا قمقموں کی تیز روشنی سے رُخساروں پر لگی ہُوئی لپ سٹک نمایاں ہونے لگی تھی۔ ریج پہ چرچ کی گھڑی میں نو بج چُکے تھے، لیکن مال روڈ اب بھی اُسی طرح جوان و پُر رونق تھی۔

اُس کے خُنک ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ اپنے سُوکھے ہونٹوں

کو زبان سے تر کرتے ہوئے اُس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ قہقہے تھے۔ زرق برق، بیش قیمت کپڑوں کی چمک تھی۔ اُس نے خود کا جائزہ لیا، ظاہر و باطن سے۔ اُس کے پیٹ میں آنتیں کلبلا رہی تھیں اور اُس کے بوسیدہ جوتے اُس کا منہ چڑا رہے تھے۔

وہ سوچنے لگا، اِس مختصر سے عرصے میں یہاں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ لیکن یہ لوگ کس قدر بے نیاز ہیں۔ قہقہے یوں گونج رہے ہیں، مسکراہٹیں یوں جگمگا رہی ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو —— گویا غریب بھو کا انسان ہی نہیں ——

وہ آہستہ آہستہ گلی کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ وہ سیڑھیاں اُترتا چلا جا رہا تھا اپنی کوٹھری کی طرف جہاں ایک کفن سا سرد، خنک بستر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ چلا جا رہا تھا۔ لیکن، ایک نئے عزم کے ساتھ، اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی منزل تھی اور اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بوسیدہ کوٹھری ہی اُس کی منزل نہیں —— اُس کی منزل بہت دُور ہے، بہت دُور!

سیّاں بچھڑ گئے

جس میں نام و مقام بھی فرضی نہیں

یُوں تو اُس کے یہاں کئی گاہک ایک سے زیادہ مرتبہ بھی آتے تھے۔ لیکن ہیمیندر اُن سب سے مُختلف تھا۔ وہ روزانہ آتا تھا، وہی پُرانی مُسکراہٹ لئے ہُوئے۔ ایک ایسی مُسکراہٹ جس سے مُسرّت سے زیادہ بے کسی ٹپکتی تھی۔ پتلا دُبلا، زرد رُو انسان، ایسا کہ اُس میں کوئی بھی کشش نہیں تھی۔ ایک ایسی شخصیّت کا مالک کہ کوئی شخص بھی اُس سے ایک سے زیادہ مرتبہ مِل لینے پر بھی اُسے بھُول سکتا تھا۔ اگر اُس کے متعلق کچھ یاد رہ سکتا تھا تو بس وُہ ایک بے کس مُسکراہٹ تھی جو ہر اچھّی بُری بات پر اُس کے سُوکھے ہونٹوں پر اُبھر آتی تھی۔ لیکن نہ جانے اوما کو اُس سے کیوں اِتنا اُنس ہوتا جارہا تھا۔ شاید یہی اُس کے لئے بہتر تھا اور اِتنی یادیں —— ہر روز ایک نیا

مرد ـــــ نئی داستان ــــــ ! اب اُس کے دِل ودماغ کو ایک نئی پیاس کا احساس ہونے لگا تھا، ایک ایسی پیاس جسے ہیمیندر کے سوکھے، باسی ہونٹ ہی بُجھا سکتے تھے۔

آج ہیمیندر معمول کے مُطابق نہیں پہنچا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ کل اُس نے کیوں اُسے اُٹھ کر چلے جانے کو کہہ دیا تھا۔ بات بھی کتنی عجیب تھی اُس نے راجندر کو اُس کے قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اُس نے کبھی کسی کو نہیں ٹوکا تھا اور اُس کا حق بھی کیا تھا؟ ــــــ وہ سوچنے لگی۔ راجندر پہلا غیر شخص تھا اُس کی زندگی میں ــــــ راجندر جب بھی اُس کے قریب رہا جب وہ کسی کی بیوی تھی اور راجندر آج بھی اُس کے قریب ہے جب وہ بکتی ہے۔ جب وہ کھڑکی میں بیٹھی گاہکوں کا انتظار کر رہی ہوتی ہے تو اُس کی نگاہیں ہر آنے جانے والے کو چیخ چیخ کر کہتی ہیں ــــــ "آؤ! خریدارو۔ آؤ! ــــــ نرگسی آنکھیں ــــــ سینے کا گداز ــــــ گلابی ہونٹ ــــــ آؤ! اِن کے دام لگاؤ! ــــــ یہ سب بک رہا ہے! ــــــ ایک عورت بک رہی ہے ــــــ اور یہ سب اُس کا ہے جو سب سے زیادہ قیمت دے سکے گا!" ــــــ لیکن آج وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب وہ بغیر قیمت کے بھی دے سکتی ہے ایک ایسی پیاس کو بُجھانے کے لئے جو سوکھے، باسی ہونٹ ہی بُجھا سکتے ہیں۔

اُس کی بےچینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کیوں نہیں آیا؟ ــــــ اِتنا

بُرا مان لیا اُس نے کل کی بات کا؟ ——— سائیکل کی ٹکر ہو گئی ہو گی؟ نہیں نہیں!! سائیکل پنکچر ہو گئی ہو گی۔ وہ سو سو طرح سے دِل کو بہلا رہی تھی۔ شاید دِل کو بہلا لینا ہی زندگی کا راز ہے۔ اگر انسان جھوٹی تسلیوں سے دِل کو نہ بہلا سکتا تو جینا کتنا دُشوار ہو جاتا؟ زندگی کا انحصار ہی اِن جھوٹی تسلیوں پر ہے۔ اِنسان پیدا ہو کر اَن گِنت سپنوں کو جنم دے دیتا ہے سپنوں کے سُنہرے جال بڑھتے جاتے ہیں اور ایک روز اِنسان کتنے ادھورے جال چھوڑ کر زندگی کی گُزرگاہ سے گزر جاتا ہے لیکن یہ جال پھر بھی بُنے جاتے ہیں اور شاید سدا ہی بُنے جاتے رہیں گے، ورنہ جینا کتنا دُشوار ہے! اِن کے بغیر زندگی کتنی بے رس ہو جاتی، اِن جالوں کو سدا ہی اُدھورا رہنا ہے۔ یہ ہر ایک جانتا ہے لیکن پھر بھی یہ بُنے جاتے ہیں ——— وہ بھی اُمیدوں کے سُنہرے جال بُن رہی تھی لیکن زندگی کا ہر وہ لمحہ جو گُزر گیا ہے لوٹ نہیں سکتا۔ وہ اُمیدوں کے سپنے جو اُس نے کبھی دیکھے اُنہیں ادھورا ہی چھوڑ کر اب وہ نئے جال بُن رہی تھی۔ جو سوچ کے تو بالکُل قریب تھے لیکن زندگی سے کوسوں دُور۔

آدھ گھنٹے سے ہلکی ہلکی بارش پڑنے کے باعث ابھی تک کوئی گاہک نہیں آیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی ——— اِتنا اچھا بھی کوئی اِنسان ہو سکتا ہے! اُس نے آج تک کبھی اُس کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ گاہک آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، لیکن وہ خاموشی سے ایک کونے

میں بیٹھا رہتا ہے اور کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ گاہکوں نے اُسے نوکر سمجھا اور سگریٹ لانے کو کہا اور وہ بغیر کسی تامل کے چلا گیا۔ آج وہ سوچ رہی تھی۔ کتنا اچھا ہوتا۔ اگر ہیمیندر اُسے سات برس پہلے مِلا ہوتا۔ جب زندگی ایک ایسا موڑ مڑ گئی تھی، جو نہ مڑنا چاہیئے تھا۔ زندگی میں کتنے موڑ آتے ہیں لیکن اُس کی زندگی میں صرف ایک ہی موڑ آیا تھا۔ ایک ایسا موڑ جس پہ پہنچ کر اُس کا احساس تک بِک گیا تھا اور آج اُس کی رُوح بے چینی کے ایک انبار تلے دبی ہُوئی تھی۔ ایک بوجھ تلے، جو لوگ اُس کے جسم کو خرید کر اُس کی رُوح پر چھوڑ گئے تھے۔

ہیمیندر کی غیر موجودگی اُسے شدّت سے محسُوس ہو رہی تھی۔ اُسے آج اپنے آپ سے شدید نفرت کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے اپنے ماحول سے نفرت محسُوس ہو رہی تھی۔ آج نہ جانے کیوں وہ اپنے ماضی کے متعلق سوچنا چاہتی تھی۔ وہ ماضی جس کی چیخ ایک مُدّت ہُوئی وہ طبلے کی تھاپول اور سارنگی کی آواز میں گم کر چکی تھی۔ ہر شخص کا ماضی کتنا حسین ہے اور ہر آنے والا لمحہ کتنا پُر اُمید لیکن وہ وقت جس میں وہ جی رہی ہے —— حال —— کتنا رُوح فرسا ہے۔ اُس کا احساس کتنا تلخ ہے اور وہ ماضی جسے اُس نے کبھی ٹھکرا دیا، اُس کی آنکھوں کے سامنے گھُوم رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کاش! وہ دِن لوٹ کر آسکتے۔ لیکن بیتے ہُوئے دِن اگر لوٹ کر آسکتے تو اُن کی یاد معنی ہی کیا رکھتی، جب بھی ہوا کے کسی تند

جھونکے سے نیچے دروازے کے پٹ کھڑکھڑاتے وہ بے چین ہو کر دروازے تک اُٹھ آتی ۔ آج اُس نے تہیّہ کر لیا تھا کہ اگر ہیمیندر آیا تو وہ اُس سے لئے ہوئے ہر تحفے کو لوٹا دے گی ۔ آج اُسے ہیمیندر کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو وہ ہر پہلی تاریخ کو کہا کرتا تھا ۔ "اومامیں تمہارے لئے اپنی آدھی تنخواہ سے یہ چیزیں خرید لایا ہوں ۔ شاید اِن کی قیمت میری آدھی تنخواہ سے بھی زیادہ ہو لیکن تمہارا حق ہے اِن پر ۔ میرا فرض ہے کہ تمہیں کچھ دوں ۔ اچھا چھوڑو اِن باتوں کو ، مَیں تمہیں مہینہ بھر میں صرف ایک مرتبہ ہی کچھ دے سکتا ہوں اور اِس کے عوض مجھے صرف اِتنا چاہیئے کہ تم مجھے یہاں روزہ آنے دو ———" اور وہ روزہ آتا تھا ۔ اُس نے کبھی سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی کہ وہ کیسے اور کیوں وہ سب کچھ لاتا ہے ۔ اُس کے لئے تو وہ محض ایک گاہک تھا ——— گھٹیا قِسم کا گاہک ——— آج اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا ، جیسے اُسی گھٹیا قِسم کے گاہک کے ہاتھ اُس نے اپنا سب کچھ بیچ دیا ہو ۔ لیکن وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ بِک کیسے گئی ؟ شاید اُسے بِکنے کی عادت ہو گئی تھی ! لیکن نہیں ، وہ تو خریدار تھی ، وہ تو چاندی کی خریدار تھی ، کڑکڑاتے ہُوئے نوٹوں کی ——— وہ کیسے بِک گئی ——— ؟

اُدھ جلے سگریٹ کو سُلگا کر وہ دریچے میں آ کر بیٹھ گئی ۔ سڑک کے کنارے لگے ہُوئے برقی قمقمے کی زرد روشنی ہلکی ہلکی بارش سے بھیگی . . .

ہوئی سڑک پر کچھ دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اندھیرے کو گھورتی رہی۔

اندھیرا! ——— دبیز اندھیرا بلا

زندگی کی زرد روشنی کے بعد کا اندھیرا!!!

وہ سوچ رہی تھی کہ آج اُس کی طبیعت میں یہ تغیر کیونکر پیدا ہو گیا؟ سات برس پہلے وہ اپنے خاوند کو محض اِس لئے ٹھکرا آئی تھی کہ وہ غریب تھا۔ اِس لئے کہ وہ اُس کے لئے زندگی کی کوئی بھی آسائش مہیا نہ کر سکتا تھا۔ آج وہ چاہتی تھی کہ اُسے ہر وہ چیز مل جائے، جسے اُس نے کبھی ٹھکرا دیا تھا ——— اور اُن بیتے ہُوئے دنوں کو واپس لانے کے لئے وہ ہیمیندر سے کہے گی کہ وہ اُسے یہاں سے لے جائے ——— کہیں ——— جہاں اُس کے جی میں آئے۔

سگریٹ اُس کی اُنگلیوں میں جل رہا تھا۔ اُس کی اُنگلیوں کو آنچ محسُوس ہوئی اور اُس نے سگریٹ نیچے سڑک پر پھینک دیا۔ سڑک سُنسان تھی ——— اُس کی زندگی کی مانند ——— اُس نے ایک نیا سگریٹ سُلگا لیا۔ دُھواں اُڑا کر وہ اُسے اُوپر اُٹھتا دیکھتی رہی۔ دُھوئیں کے مرغولے اپنے خم کھول کھول کر فضا میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ اُسے اپنے ماضی کے خم بھی کھُلتے ہُوئے محسُوس ہونے لگے ——— اُس ماضی کے جسے اُس نے یُوں فراموش کر دیا تھا جیسے ریگستان کی کوئی قبر ایک ہی رات میں لاکھوں من ریت تلے دب کر خود کو گم کر دے۔

٭ ٭

آج تک تو وہ جیسے تیسے دن کاٹ ہی رہی تھی، لیکن اب سسرال میں اُسے اپنے ارمانوں کا دَم گھُٹتا ہُوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ آخر کب تک وہ سُسرال میں پڑی رہے گی اور اسی سوچ نے اُسے پاگل کر دیا تھا۔ یہاں سبھی لوگ ہنستے کھیلتے تھے لیکن بس ایک وہی تھی جو کمرے میں بند پڑی رہتی تھی۔ وہ سوچتی، اِس شادی کے بغیر ہی وہ اچھی تھی۔ اُسے آزادی تو تھی، جہاں جی چاہتا تھا جا سکتی تھی اور جو جی چاہتا تھا کر سکتی تھی۔ یہ شادی نہ ہُوئی قید ہو گئی ——— اور سُسرال جیل کی کوٹھری سے بھی بدتر۔

ہر وقت کی ٹوک ——— یہ مت کرو، وہ مت کرو ——— یہ ایسے نہیں، ویسے ہوگا ——— کئی بار اُس کے جی میں آئی کہ وہ ونود کو خط لکھے لیکن وہ نہ لکھ سکی۔ وہ دل ہی دِل میں سب کو کوستی رہتی۔ جب رجنی، آشا اور کانتا اچھے اچھے کپڑے پہن کر سیر کو جاتے تو اُس کے دِل کی آگ اور بھڑک اُٹھتی۔

جب سے وہ سُسرال میں آئی تھی ——— یہی سُن رہی تھی کہ ونود کو مکان نہیں مِل رہا اور مکان ملتے ہی وہ اُسے بُلا لے گا۔ لیکن کل شام جب اُس نے آشا سے سُنا تھا کہ مکان تو بہت ملتے ہیں لیکن ونود بھیّا کی تنخواہ تھوڑی ہے اِس لئے ——— دِقّت ہو رہی ہے۔ جبھی سے وہ سوچ رہی تھی کہ کتنا اچھا ہوتا، اگر اُس کی شادی کہیں اور ہو گئی ہوتی ——— کہیں اور ——— لیکن یہ سوچتے ہی اُسے احساس ہونے لگتا کہ یہ پاپ ہے۔ اب اُسے ایسی

باتیں نہ سوچنا چاہئیں۔ لیکن وہ بغاوت پر آمادہ تھی۔ پاپ! ـــــ اگر اُس کی شادی کہیں اور ہو گئی ہوتی، تو یہ پاپ نہ ہوتا، لیکن شادی یہاں ہو گئی ہے اِس لئے یہ پاپ بن گیا ہے۔ وہ اب یہ سب ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ عورت گائے بھینس نہیں ہے کہ جس نے خرید لی اُسی کی ہو گئی۔

اُس رات اُسے بہت دیر میں نیند آئی۔ اُسے اپنے جسم سے آگ نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ آگ بڑھتی ہی گئی۔ وہ اَن جانے مردوں کا تصوّر کر کے ـــــ انہیں اپنے جسم کے قریب سوچ کر، خود کو اُن کے بازوؤں میں تصوّر کر کے دِل بہلاتی رہی۔ لیکن آگ کم نہ ہوئی۔ اُس کی پیاس بڑھتی ہی گئی۔ اُس کا احساس اُسے بہت دُور دُور تک لے گیا۔ وہ سب کچھ سوچتی رہی جو اُسے نہ سوچنا چاہیئے تھا۔ آخر اُس کی آنکھ لگ گئی۔ دُوسرے دِن صُبح جب اُس کی آنکھ کھُلی تو رجنی اُسے جگا رہی تھی۔

"بھابی! او بھابی!! بھیّا کا تار آیا ہے۔ لکھا ہے اوما کو بھیج دیجئے مکان مِل گیا ہے ـــــ اور پتا جی کہہ رہے تھے اوما کو آج شام کی گاڑی سے بھیج دو۔"

وہ تمام دِن سپنوں میں کھوئی رہی۔ سُنہرے سپنوں میں وہ آشاؤں کے محل بناتی رہی۔ اُس کے خیالوں میں ایک سوَرگ کی تخلیق ہوتی رہی۔ جہاں وہ اور ونود ہی ہو گا اور دُوسرا کوئی نہیں ـــــ ہاں! دُوسرا کوئی نہیں ـــــ اور شام کی گاڑی سے وہ چلی آئی تھی۔ ونود اُسے اسٹیشن پر لینے آیا

ہوا تھا لیکن وہ اُسے پہچان بھی نہ سکی تھی۔ جب رامو نے اُس سے پوچھا تھا "چھوٹے بابو سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا!"—— تو اُس نے گھونگٹ نکال لیا تھا، اور اُس کے سپنوں کے محل ایک ہی پل میں مسمار ہو گئے تھے۔ اُس نے سوچوں کے کتنے گھروندے بنا رکھے تھے۔ اُس نے تو سوچا تھا ونود لمبا چوڑا کڑیل جوان ہو گا۔ وہ دُوسرے لوگوں کی طرف دیکھتی رہی جو خوبصورت تھے جنہوں نے اچھے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کے دِل میں ونود کے لئے ایک نفرت نے جنم لے لیا اور وہ نفرت بڑھتی ہی گئی——

ونود کے پاس آئے ہوئے اُسے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ ونود کی محبت کے باوجود اُس کی نفرت شدید ہوتی گئی۔ دِن بیتنے لگے۔ لیکن اُسے ہر لمحے احساس رہتا کہ ونود کے پاس نہ رہ سکے گی۔ وہ اکثر سوچتی کتنی خاموش زندگی ہے اُس کی۔ ایک گندے جوہڑ سی جس میں کبھی لہریں نہیں اُٹھتیں اور کبھی ارتعاش نہیں ہوتا اور ونود ایک ایسے بچّے کی مانند تھا جو دِل بہلانے کو جوہڑ کے کنارے بیٹھا سنگریزے پھینک پھینک کر گندے پانی میں ارتعاش پیدا کر کے لُطف حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن ونود کی محبّت اُس کے جذبات میں ایک بھی لہر پیدا نہ کر سکی۔

دِن بیتتے گئے۔ اُس ایک کمرے کی دیواروں پر دُھواں جمتا گیا۔ وہ اور سیاہ ہوتی گئیں۔ اُس کے دِل میں ونود کے لئے جو نفرت پیدا ہو گئی تھی، بڑھتی گئی—— مکان مِل گیا ہے! ایک کمرہ جو باورچی خانہ بھی ہے

غسل خانہ بھی، سونے کا کمرہ بھی ـــــــــ جب وہ سوچتے سوچتے تنگ آجاتی تو اُس کھڑکی میں آکر بیٹھ جاتی جو سڑک کی طرف کھُلتی تھی۔ آتے جاتے لوگ اُسے دیکھتے اور آوازے کستے ـــــــــ وہ دِل میں سوچتی کاش! اِن میں سے کوئی ـــــــــ ہاں! کوئی یہاں آجائے۔ وہ ایک لاش کی مانند خود کو اُس کے حوالے کر دے گی لیکن ونود سے وہ دُور چلی جانا چاہتی تھی۔

جب ونود شام کو دفتر سے لَوٹ کر آتا تو اُس کے بال اُلجھے ہُوئے ہوتے۔ سارا دِن ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر کام کرنے سے اُس کی پینٹ گھٹنوں پر سے آگے کو نِکلی ہوئی ہوتی۔ ایک ہاتھ میں ترکاری کا جھولا پکڑے اور دُوسرے میں فائلوں کا پلندہ لیے جب وہ آکر پلنگ پر بیٹھ جاتا اور اُس کی طرف مُسکرا کر دیکھتا تو وہ نیچے سڑک کی طرف دیکھنے لگتی۔ موٹروں میں، تانگوں میں، سائیکلوں پر کالجوں کے خوشباش نوجوان، بڑے بڑے رئیس گزر رہے ہوتے۔ وہ اُن کی سج دھج کو دیکھتی اور سوچنے لگتی کہ وہ لوگ ونود سے کس قدر مُختلف ہیں اور ـــــــــ اور جب وہ اُن عورتوں کو دیکھتی جو جاذب نظر لباس، قیمتی گہنے پہنے، مُسکرا مُسکرا کر دُوسرے لوگوں سے باتیں کر رہی ہوتیں تو اُس کی نفرت اور بھی شدید ہو جاتی۔ کھڑکی سے اُٹھ کر وہ ونود سے بات کرنے کی بجائے اُس کی مُسکراہٹ کا جواب دیئے بغیر جھولے سے سبزی نکال کر بیٹھ جاتی ـــــــــ وہ اُسے اپنی طرف پیاسی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دیکھتی، لیکن اُسے یُوں محسُوس ہوتا جیسے وہ اُس کی پیاس نہ بُجھا سکے گی

— جیسے اُس کے پاس ایک بھی مُسکراہٹ ایسی نہ تھی جو ونود کے لئے ہو —

دو سال کے عرصے میں ونود اُسے صرف ایک مرتبہ سنیما لے گیا تھا۔ اور وہ پانچ روپے جو اُس نے اُس روز خرچ کئے تھے اُسے کسی سے اُدھار لینا پڑے تھے۔ سنیما ہال میں بیٹھے ہُوئے فلم شروع ہونے پر اُس نے ونود کے دوست راجندر کے جسم سے جان بُوجھ کر اپنے جسم کو مَس ہونے دیا تھا۔ وہ جان بُوجھ کر اُس کی طرف جُھک گئی تھی۔ ونود فلم دیکھنے میں محو ہو رہا تھا اور راجندر کے ہاتھ اُس کے جسم پر پھسلنے لگے تھے۔ اُس رات ونود کے قریب ہوتے ہُوئے بھی اُسے سکُون سا محسُوس ہو رہا تھا۔ اُسے محسُوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے جسم میں بھڑکتی ہُوئی آگ سِسکنے لگی ہو۔

دِن کو ونود دفتر چلا جاتا اور راجندر اُس کی جگہ لے لیتا۔ پھر راجندر کے اور دوست بھی اُس کے ساتھ آنے لگے تھے۔ لیکن اُسے کچھ بھی بُرا محسُوس نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے جسم پر وہی پُرانے بوسیدہ کپڑے تھے۔ کوئی گہنا نہیں بڑھا تھا۔ لیکن اُسے ایک قِسم کی طمانیت کا احساس تھا۔ اُس کے پاس جو بھی آتا تھا وہ ونود سے مُختلف ہوتا تھا —— اور یہی وہ چاہتی تھی۔ اب جب بھی وہ کھڑکی میں بیٹھ جاتی، اور سڑک پر سے گُزرتی ہُوئی موٹروں تانگوں میں سوار عورتوں کو دیکھتی —— اُنہیں مُسکراتے دیکھتی تو اُسے محسُوس ہوتا کہ اُسے بھی اُن جیسی مُسکراہٹ مِل گئی ہے ——

اور اب اُس کے گرہ دھی زندگی کی سج دھج تھی ——— نئے نئے، خوبصورت چہرے ———

وہ اکثر سوچتی رہتی کہ وہ راجندر سے کہے گی کہ اُسے یہاں سے لے کر کہیں چلا جائے۔ ونود کی ایک ایک بات سے اُسے نفرت ہو گئی تھی وہ اُس کی دُنیا سے دُور نکل جانا چاہتی تھی۔ وقت نے کروٹ بدلی اور ساتھ ہی اُس کی زندگی نے۔ ونود کا تبادلہ دہلی ہو گیا۔ دہلی ایک نئی جگہ تھی ——— اجنبی لوگ ——— لیکن اِس بار اُسے کوئی پریشانی نہ ہُوئی۔ اُس کے افسر ورما نے اپنے بنگلے میں اُسے ایک کمرہ دے دیا۔

ورما اور وہ ایک دُوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ وہ جگہ جو راجندر کے نہ ہونے سے خالی ہو گئی تھی اُسے ورما نے پُورا کر دیا۔ اور وہ خود بھی تو چاہتی تھی کہ ونود کی جگہ کوئی ورما ہو! ——— کوئی!! ——— لیکن ایک روز جب ونود نے اُسے ورما کے ساتھ دیکھ لیا تھا، تو وہ چندو کے ساتھ بھاگ نکلی تھی اور چندو اُسے یہاں لے آیا تھا ——— جہاں شربتی آنکھوں ——— گدازجسموں اور رسیلے ہونٹوں کی قیمت ملتی ہے۔

"سیٹھ جی آئے ہیں!"

چندو کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے نیچے بازار کی طرف نگاہ دوڑائی بارش تھم چُکی تھی۔ رونق بڑھ رہی تھی۔ جیسے چیلوں کا ایک غول کسی

بوٹی پر جھپٹ پڑے۔ بہت سی نگاہیں اُس کی کھڑکی کی جانب اُٹھ گئیں۔ وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ اُس کے بہت سے گاہک آچکے تھے۔ وہ گانے بیٹھ گئی۔

جب تک وہ گاتی رہی، اُس کی نگاہیں دروازے پر جمی رہیں۔ آج اُس کے سامنے بیٹھے ہُوئے لوگ بڑے بڑے امیر آدمی تھے، بہترین کپڑے زیب تن کئے ہوئے، لیکن ہمیندر نہیں آیا اور اُسے آج صرف ہمیندر چاہیئے تھا۔

جب سب لوگ چلے گئے تو وہ پھر کھڑکی میں آکر بیٹھ گئی۔ سڑک سُنسان ہو چکی تھی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے برقی قمقمے کی زرد روشنی بارش سے بھیگی ہوئی سڑک پر کچھ دُور تک پھیلی ہوئی تھی ——— وہ اندھیرے کو گھورتی رہی۔

اندھیرا! ——— دبیز اندھیرا !!

زندگی کی زرد روشنی کے بعد کا اندھیرا !!!

وہ اُمیدوں کے جال بُن رہی تھی۔ لیکن زندگی کا ہر لمحہ جو گُزر گیا ہے لَوٹ نہیں سکتا۔ وہ سپنوں کے جال جو اُس نے کبھی بُنے تھے، انہیں اُدھورا ہی چھوڑ کر اب وہ نئے جال بن رہی تھی، جو سوچ کے تو بالکُل قریب تھے لیکن زندگی سے کوسوں دُور ———

چندرا کے یہاں آج بہت گاہک آئے تھے۔ وہ ابھی تک گا رہی تھی۔

سیّاں بچھڑ گیو ری ——— بہت دِن بیتے

وطن سے دور

مَیں جا رہا ہوں وطن سے دور —— دور —— بہت دور —— مَیں جا رہا ہوں، تم سے دور —— بہت دور —— اب تم میرے دِل کی دھڑکنیں نہ سُن سکو گی۔ میرے لب ہل رہے ہیں۔ مَیں گُنگنا رہا ہوں —— ایک گیت۔ لیکن گاڑی کے پہیوں کی کھٹ کھٹ میں گم ہو رہی ہے میری آواز —— بالکل اسی طرح جس طرح غریبوں کی چیخ پکار امیروں کے ایوانوں کے باہر ہی گم ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھو! کسی الھڑ دوشیزہ کی باہوں کی مانند لہرا رہی ہیں درختوں کی ڈالیاں۔ میرا جی چاہ رہا ہے مَیں کچھ یاد کروں۔ لیکن میرا دِل غم کی شدّت سے کراہ رہا ہے۔ مجھے اپنے میں ایک کمی کا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے یُوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے میرے جسم سے میری رُوح نکالی جا رہی ہو۔ گاڑی بھاگتی چلی جا رہی ہے۔

اندھیرا بڑھا چلا آرہا ہے۔ اندھیرا چھا رہا ہے، اُن ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں پر۔ لیکن امیروں کے ایوان اب بھی جگمگا رہے ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ رات کی سیاہی اتنی دبیز، اتنی گہری ہو جائے کہ امیروں کے ایوانوں میں جگمگاتے ہوئے روشنی کے قمقمے بھی اِسے دور نہ کر سکیں۔ یہ جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے رات کی تاریکی کو دور کر کے اِن ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کا مذاق نہ اُڑائیں۔ میرے خیالات کے سمندر میں دھڑک رہی ہے تمہاری یاد کی کشتی۔ سوچ رہا ہوں کتنے حسین تھے وہ لمحات جو سکھ کی گھڑیوں کی مانند، ایک سپنے کی مانند گذر گئے ——— اور اب میں جا رہا ہوں پہلو میں لئے ہوئے درد کا طوفان۔ اِسی طوفان میں ایک تباہ شدہ جہاز کے ٹوٹے ہوئے تختوں اور پھٹے ہوئے بادبانوں کی مانند، کہیں کہیں ڈگمگا رہے ہیں ماضی کے حسین لمحات ———!

پہلی مرتبہ تم مجھے "عمر خیام ریسٹورانٹ" میں ملی تھیں۔ اپنے اپنے میزوں پر ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مجھے تمہاری ایک لٹ کا جھوم جھوم کر تمہارے عارضوں سے اٹھکھیلیاں کرنا بہت بھا گیا تھا اور مَیں اپنے دِل سے کہہ رہا تھا۔ اِسے تُم نے قصداً یا عادتاً جیسے بھی یُوں لہرا رکھا ہو، یہ ایک پیاری اور معصوم ادا ہے ——— اور میرے جذبات تمہاری لَٹ کے خم بن کر رہ گئے تھے۔

چاند بدلیوں سے نکل رہا ہے۔ بدلیاں روشن ہیں چاند کی میٹھی میٹھی روشنی سے ——— گاڑی کی کھٹ کھٹ ایک ہنگامہ بپا کرتی ہوئی چلی

جا رہی ہے اور ہر لمحہ میں تم سے دُور ہوتا جاتا ہوں ——— دُور بہت دُور ———!

میرے کمپارٹمنٹ میں پانچ آدمی اور ہیں۔ پانچوں کے پانچوں میجر ہیں اور میں صرف ایک لفٹیننٹ۔ سب لوگ سو رہے ہیں، ایسے جیسے یہ سب ایک ابدی نیند کے متلاشی ہوں۔ یہ سب میرے ساتھ فرنٹ تک جائیں گے۔ میرے سامنے میجر نریندر کی شراب کی بوتل پڑی ہے، جو ایک تہائی ختم ہو چکی ہے۔ نہ جانے کیوں آج میرے جی میں بھی آ رہی ہے کہ میں بھی پی لوں۔ یہ سب لوگ شاید اس لئے اتنی بے پروائی سے سو رہے ہیں کہ شاید پھر انہیں اس پیکر میں سانس لینے کا موقعہ نہ ملے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلطی پر ہیں۔ انہیں تو جاگتے رہنا چاہیئے، انہیں تو چاہیئے کہ دل کے سارے ارمان نکال لیں ——— شاید ان کے دلوں میں ارمان ہی نہ ہوں گے۔ کنوارے فوجی اور پھر بوڑھے ——— حسرتوں کا چشمہ ہی سوکھ چکا ہے۔ دھیرے دھیرے بدلیوں نے پھر چاند کو اپنے پہلو میں چھپا لیا ہے اور چاند کی میٹھی میٹھی ہنسی گم ہو گئی ہے۔ ہوا کے سرد جھونکے تیزی سے آ رہے ہیں اور ان جھونکوں سے میرے بال پریشان ہو گئے ہیں اور مجھے اپنے بالوں کو سمیٹتے ہوئے وہ رات یاد آ رہی ہے، جس رات ہم دونوں تاج محل دیکھنے گئے تھے۔ تاج ——— دو دلوں کی دھڑکنوں کی تصویر ——— ایک لافانی محبت کی ابدی یادگار ——— ہمارا کمپارٹمنٹ بک ہو چکا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ یوں تو میں

نے کئی بار چاند کو مسکراتے دیکھا ہے۔ لیکن میں وہ رات نہیں بھول سکتا۔ تم نیند کے خمار سے بوجھل پلکیں لئے ہوئے کھڑی ہو کر انگڑائی لینے لگی تھیں۔ تمہاری نیم باز آنکھوں میں شباب کے ڈورے مچل رہے تھے۔ تم میری آغوش میں گر پڑی تھیں۔ میری باہوں کا دائرہ تنگ ہوتا چلا گیا تھا تمہاری زلفیں ہوا کے مستانہ خرام جھونکوں سے میری گردن سے لپٹنے لگی تھیں۔ اور چاند شرما رہا تھا——— وہ رات کتنی حسین تھی، جو ہم نے چنار کے سایوں میں، چاند کی ضیا سے دمکتے ہوئے تاج کو دیکھتے ہوئے گذاری تھی۔ اور ہم نے عہد و پیمان کئے تھے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے۔ لیکن آج شاید تم سوچ رہی ہو گی کہ میں اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکا۔ ہاں! شاید تمہارا خیال صحیح ہو۔ میں یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتا کہ میں وطن کی خاطر اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ اعتراف لوگوں کے سامنے کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا کہ میں اگر جان کو ہتھیلی پر رکھ رہا ہوں تو اپنے وطن کی خاطر نہیں، یا فرنگی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کیلئے نہیں، غربت کے آثار مٹانے کیلئے میں ایک ناکام کوشش کر رہا ہوں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میں واپس نہ آسکوں گا۔ یہ ایک حقیقت ہے جو میرے ذہن پر ابھر آئی ہے۔ تمہارے جی میں آئے تم اسے بزدلی کے نام سے موسوم کر لو۔

پو پھٹنے لگی ہے۔ آسمان پر یوں لالی بکھری ہے جیسے کسی سانولی دوشیزہ کے منہ پر کسی نے گلال مل دیا ہو۔ تم شاید سچ نہ مانو گی لیکن میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں کہ یہ وہ پہلی سرخی ہے جسے میں نے صبح کے وقت

آسمان پر دیکھا ہے۔ میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ یہ لالی سورج کے غروب ہوتے وقت ہی ہوتی ہے۔ لیکن آج پتہ چلا ہے کہ زندگی دکھ کی سرخیوں سے نکلتی ہے ـــــ قرار پانے کے لئے۔ لیکن ان ہی سرخیوں میں آخر ایک دن سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ گاڑی بھاگتی چلی جارہی ہے۔ شام تک شاید ہم بندرگاہ تک پہنچ جائیں۔ اس ساری گاڑی میں تقریباً آٹھ سو سپاہی ہوں گے۔ ہمیں اپنی اُن فوجوں کی امداد کے لئے بھیجا جارہا ہے جو دور کے ایک جزیرے میں بہت خطرے میں ہیں۔ گاڑی میں چڑھنے سے پہلے میں نے ان سپاہیوں کے چہروں پر چھائی ہوئی مُردنی دیکھی تھی۔ ایک ان جانا سا خوف ـــــ یہ بے پروا فوجی اب بھی خاموش ہیں ـــــ ساری گاڑی میں سکوت ہے۔

سب لوگ جاگنے لگے ہیں۔ میجر نریندر اُٹھتے ہی میری گردن میں بانہیں ڈال کر کہنے لگے "میری جان! تم رات شاید سوئی نہیں"۔ بس یہی ایک زندہ دل آدمی ہیں۔ میرے بڑے بھائی اور نریندر نے ساتھ ہی ایم۔ اے کیا تھا۔ لیکن یہ میجر ہیں اور وہ صرف ایک معمولی سے کلرک صرف اس لئے کہ نریندر کے والد آئی۔سی۔ایس تھے۔ اور میرے والد ایک مزدور، کسان۔

ہم سب اپنے دلوں میں ڈکٹوریہ کراس لینے اور کرنل بننے کے خواب لئے جارہے ہیں اور یہ سوچتے سوچتے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور چہرہ دل

پر چمک آجاتی ہے۔ لیکن پھر موت کا خیال آتے ہی چہرے زرد پڑ جاتے ہیں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اُبھر آتے ہیں۔ گاڑی بھاگتی چلی جا رہی ہے ہم وطن سے دُور ہوئے جاتے ہیں۔ دُور ——— بہت دُور ———

گاڑی ایک انجانے مقام پر کھڑی ہو گئی ہے۔ نئے بھرتی ہوئے فوجی گھبرا گئے ہیں۔ اُن کے دماغوں پر بمباری کے بھیانک منظر اُبھر آئے ہیں لیکن جلد ہی وہ قطار در قطار چائے لینے کے لئے ریفرشمینٹ کمپارٹمنٹ کی طرف چلے جانے لگے ہیں۔ ہمارے کمپارٹمنٹ میں بھی چائے پہنچ چکی ہے۔ ہم لوگ بھی چائے پی رہے ہیں۔ اور چُپ ہیں، بالکل خاموش۔ کبھی کبھی میجر نریندر کسی پر کوئی فقرہ کس دیتے ہیں اور ہونٹوں پر صرف ایک پھیکی سی مُسکراہٹ ایک لمحے کے لئے پھیل جاتی ہے۔ جیسے شمشان بھُومی پر کچھ دیر کے لئے آگ کی لپٹیں بلند ہو جاتی ہیں ——— اُداس لپٹیں ———

گاڑی پھر ایک دھچکے سے رینگنے لگی ہے اور رفتار پکڑتی جا رہی ہے۔ میں اپنے بازوؤں پر ٹھوڑی لگائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہوں۔ اُونچے اُونچے پہاڑ دیوتاؤں کے مجسموں کی مانند خاموش کھڑے ہیں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں پہاڑوں پر پھیلی پڑی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی کھیتوں میں عورتیں دھان بو رہی ہیں ——— اِن عورتوں میں سُہاگنیں بھی ہوں گی اور کنواریاں بھی۔ قبروں میں پاؤں لٹکائے بُوڑھیاں

بھی۔ اور شاید کوئی کنواری یہ بھی سوچ رہی ہو گی کہ دھان کی فصل پکنے تک میرا پردیسی ساجن بھی لڑائی سے لوٹ آئے گا۔ لیکن وہ آئے گا؟ اِس کا جواب سوچتے سوچتے مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے مَیں نے اُس کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا ہو۔

پہاڑوں کے سلسلے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب ہم میدانی علاقہ کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اب کھیت کچھ بڑے بڑے ہیں لیکن واپس آنے والے کے لئے پہاڑوں کے شروع ہونے اور جانے والے کیلئے پہاڑوں کو چھوڑنے کے آثار باقی ہیں۔

ہم اب ایک چھوٹے سے دریا کے کنارے پہنچ چکے ہیں۔ ہمیں سٹیم بوٹ میں دُوسرے کنارے لے جایا جا چکا ہے۔ ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ اسی دُوسرے کنارے کچھ تھوڑے سے فاصلے پر ایک سپیشل گاڑی تیار ہے۔

ہمارے ساتھ کچھ فرنگی نرسیں بھی ہیں۔ گاڑی کے قریب پہنچتے ہی نریندر ہمارے قریب آ کر بولے۔ "چلو۔ تم ہمارے ساتھ ——— گاڑی بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ مَیں اور نریندر نرسوں کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہیں۔ یہ جوان نرسیں شراب کے نشے میں مست ہیں ——— میرے کاندھے پر سر رکھے روبی بیٹھی ہے۔ روبی حُسن وجوانی کا دلکش و دلنواز پیکر ہے۔ صُراحی دار گردن، ستواں ناک، سُرخ وسپید رُخسار، مست و مخمور آنکھیں اور اِن میں سُرخ سُرخ ڈورے۔ مَیں کھوتا جا رہا ہوں۔ دِل کا قرار ———

میجر نریندر چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہیں اور یہ فرنگی عورتیں ——— انہیں دیکھو۔ یہ آج کالے آدمیوں کے ساتھ بھی خوش ہیں۔ شراب کے نشے میں مدہوش روبی کاندھے پر سر رکھ کر سو گئی ہے۔ اُس کے سُنہرے گیسُو میرے کاندھے پر بکھرے ہُوئے ہیں۔ مَیں نے روبی کا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا ہے اور میرے ہاتھ ——— ! تم تو جانتی ہی ہو کتنے گُستاخ ہیں۔ یہ آج بھی کُچھ حسین سی گُستاخیاں کر رہے ہیں۔ اُفق پر سُرخی اُبھر آئی ہے شام ہوتی جا رہی ہے۔

چائے آچکی ہے۔ روبی کی پلکیں اب بھی خمار سے بوجھل ہیں۔ مَیں نے ابھی روبی کے پرس میں لگے ہُوئے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا تھا۔ اب میرے چہرے پر افسردگی کے تاثرات نہیں ہیں۔ مَیں خوشی کے سوا اور کوئی بات نہیں سوچ سکتا۔ شاید شمع بُجھنے سے پہلے شمع کی لَو تیز ہو رہی ہے۔ قہقہے مُسکرا رہے ہیں اور ہم لوگ چائے پی رہے ہیں۔ روبی کے دِل میں جذبات کا طُوفان موجزن ہے ——— بار بار اُس کی باہیں میری گردن کے گرد حمائل ہو جاتی ہیں۔ سامنے بیٹھی ہُوئی نرس ایک انگریزی میگزین دیکھ رہی ہے۔ سرورق پر ایک تصویر ہے۔ دو پنچھی چونچ سے چونچ ملا رہے ہیں ———

بندرگاہ اب قریب ہی ہے۔ ہم لہروں کے ساحل سے ٹکرانے کی آواز سُن رہے ہیں۔ اب ہم سب کُچھ لیے چین سے ہیں۔ میجر نریندر اپنی

رفیقۂ سفر کا سامان بندھوا رہے ہیں۔ روبی نے میری طرح اپنا سامان جو ایک اٹیچی اور بستر پر مشتمل ہے، پھیلانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی، اور ضرورت محسوس بھی کیوں ہوتی؟ کیا میری آغوش میں اتنا بھی قرار نہ تھا؟ کیا ایک غلام ملک میں پیدا ہوا انسان احساسات کی تپش نہیں رکھتا؟

بندرگاہ پر کھڑے ہوئے جہازوں کے مستول صاف نظر آ رہے ہیں۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں۔ جبھی شاید چہروں پر اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ جی میں آ رہی ہے۔ کاش! یہ سفر کبھی ختم ہی نہ ہوتا۔ گاڑی کی رفتار کم ہوتے ہوتے بالکل تھم گئی ہے۔

ہم بندرگاہ پر پہنچ چکے ہیں۔ ہمارا سامان ڈیک پر رکھا جا رہا ہے۔ اس وقت دل سے ہمدردی، حسد، رشک، سبھی جذبے محو ہو گئے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آہنی گولیوں کے سوا ہمارا کسی سے کوئی رشتہ نہیں۔ سپاہی بے دلی سے سامان ڈیک پر پھینک رہے ہیں اور ہر زور کی "ٹھا" کی آواز پر گولی چلنے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

جہاز کا وسل بج گیا ہے۔ دھیرے دھیرے جہاز پانی میں بڑھتا جا رہا ہے اور یوں ڈول رہا ہے جیسے کسی البیلی کے دل میں ارمان ——

مَیں ڈیک پر لگے ہوئے جنگلے کے سہارے کھڑا ہوں، اور کچھ لوگ بھی ڈیک پر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ میجر نرہندر اپنے کیبن میں ہیں۔ اور ہوں بھی کیوں نہ؟ وہ میری طرح تھوڑے ہی ہیں۔ مَیں بے قرار ہوتے ہوئے بھی قرار نہیں

ڈھونڈتا اور وہ قرار پاکر بھی قرار پانے کی سعی میں مصروف ہیں۔ ہر انسان کی فطرت کتنی مختلف ہوتی ہے۔ تمہیں دیکھ لو۔ تم کتنی رنگین طبع ہو اور میرے تمہارے تعلقات بھی شاید اسی سبب بڑھے تھے کہ تم سمجھتی تھیں کہ سبھی "فوجی" رنگین طبع ہوتے ہیں لیکن تم نے مجھے کتنا مختلف پایا۔ اِس کا اعتراف تم مجھ سے کئی مرتبہ کر چکی ہو۔ ہمیں رنگین طبع بننا پڑتا ہے۔ اِس لئے کہ ہمیں کبھی آئندہ لمحے کا یقین نہیں ہوتا۔ کب اور کیسے آنے والا سیکنڈ گذرے گا؟ ہم فوجی یہ نہیں جانتے۔ دُھند چھا رہی ہے اور یہ اچھا ہو گا یا بُرا؟ یہ مَیں نہیں کہہ سکتا، لیکن اِس کی مدد سے ہم آئندہ کچھ لمحے زندہ رہنے کا اعتبار قائم کر سکتے ہیں۔ اب "خطرے کا علاقہ" شروع ہو گیا ہے۔ ہم لوگ اپنے اپنے کیبنوں میں مسلح، گردنوں میں لائف بیلٹس ڈالے، ہر آنے والے خطرے کے لئے تیار ہیں۔ دستانے پہنے ہوئے مَیں رائفل تھامے بیٹھا ہوں۔ میرے ہاتھ سرد ہوئے جاتے ہیں اور اگر اِس وقت حملہ ہو گیا تو پانی کی خنکی ہی ہمیں سرد کر دے گی۔ لیکن خود کو دُھند پر چھوڑتے ہوئے ہم ابھی اتنے نازک لمحوں کے آنے کی اُمید نہیں رکھتے۔ ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔ اِس لئے مجھے مجبوراً اپنے کیبن کی کھڑکی بند کرنی پڑی ہے۔ جہاز سمندر کے سینے کو چیرتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا ہے اور وہ جزیرہ جس کے بچاؤ کے لئے ہمیں بھیجا جا رہا ہے، نزدیک سے نزدیک تر ہوا جاتا ہے۔ میری آنکھوں میں غنودگی چھا رہی ہے۔ مَیں کرسی پر سے اُٹھ کر پلنگ پر

لیٹ گیا ہوں۔ گو ہمیں سونے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن میری آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی ہیں۔

اب جو آنکھ کھلی ہے، تو صبح کے سات بج چکے ہیں۔ میں اپنے کیبن سے باہر چلا آیا ہوں۔ سورج کی سنہری کرنیں نیلگوں پانی پر ناچ رہی ہیں۔ دو گھنٹے تک ہم جزیرے پر پہنچ جائیں گے، جہاں ہمیں مادرِ وطن پر قربان ہونے کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ سپاہی، نرسیں، افسر، سبھی باہر ڈیک پر آ گئے ہیں۔ نرسیں اب بھی خوش ہیں، مسرور ہیں۔ اِن کی دِل بستگی کا خاطر خواہ سامان موجود ہے۔ بہترین سے بہترین شراب اور ایک سے ایک حسین اور قوی مرد ——— بس ——— میں اِن کی فطرت کو اور نمایاں نہیں کرنا چاہتا۔

روبی میرے ساتھ ریلنگ پر جھکی کھڑی ہے اور ہم مستقبل کی سوچ رہے ہیں۔ روبی کہہ رہی ہے "اگر ہم زندہ لوٹ آئے، تو تم میجر تو ہو ہی جاؤ گے۔ بس ہم شادی کر لیں گے ———" روبی یہ سب کہتی چلی جا رہی ہے اور میرے ذہن پر تمہاری تصویر اُبھر آئی ہے۔ میں تو روبی سے انکار کر کے تم سے شادی کا ارادہ بھی کر لوں۔ لیکن اُس وقت تک شاید تم اپنے بے قرار جذبات پر قابو نہ رکھ سکو گی ——— لیکن پھر بھی یہ سب جانتے ہوئے بھی، نہ جانے کیوں؟ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تمہارے ساتھ ایک انجانے رشتے میں بندھ گیا ہوں۔ میرے دل کا

قرار تمہاری نگاہوں کے خُمار میں گُم ہو گیا ہے۔ تمہاری مستی چھلکاتی آنکھیں۔

جزیرہ ایک دھبّے کی مانند دُور، نظر آ رہا ہے، اور دھبّہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ مطلع صاف ہے۔ بمباری کا ابھی کوئی امکان نہیں۔ اِس کی ہمیں اطلاع مِل چُکی ہے۔ مَیں نے ابھی دُوربین سے دیکھا تھا۔ ہمارے جزیرے کا کمانڈر ہمارے جہاز کو دیکھ رہا ہے۔ ہمارے جہاز پر "یونین جیک" لہرا رہا ہے اور میرا دِل کہہ رہا ہے۔ کاش! آج اِس جہاز پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہوتا۔ پھر ——— پھر کوئی جذبہ ایسا دِل میں پیدا نہ ہوتا جس کے زیرِ اثر ہم مرنے سے گریز کرتے۔

جہاز جزیرے کے بالکُل قریب پُہنچ گیا ہے۔ ہم اب جزیرے پر گشت کرتے ہُوئے فوجیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ بڑی بڑی توپیں آگ بنا ہُوا لوہا اُگلنے کے لئے تیار ہیں۔ ہر آدمی چوکنّا ہے۔ ہمارا جہاز کنارے سے لگ چُکا ہے۔ ہمارا سامان اُتارا جا رہا ہے۔ ہمیں بتایا جا چُکا ہے کہ اِس جزیرے پر حملہ ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے۔ اِس کے پاس والا جزیرہ دُشمن کے ہاتھوں میں ہے۔

آج تین دِن سے لگاتار ہم دُشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہماری گنتی ختم ہو چکی ہے۔ مَیں، نریندر اور گیارہ سپاہی مورچوں پر بیٹھے ہیں۔ مَیں مشین گن کی لبلبی دبائے بیٹھا ہُوں۔ ایک ہنگامہ بپا ہے۔ اب جزیرہ اپنے ہاتھوں میں رکھنے کی ہمیں کوئی اُمّید نہیں۔ ہماری حالت ایک ایسے

ملّاح کی سی ہے جس کی کشتی دُور سمندر میں ہو، جس کے لئے واپس آنا بھی ناممکن ہو اور آگے بڑھنا بھی دُشوار۔ لیکن ہم آگے بڑھنے کے سِوا اور کوئی راستہ نہیں دیکھ رہے ہیں۔

ہم اب صرف دو رہ گئے ہیں۔ گولیاں سائیں سائیں کرتی ہُوئی ہمارے پاس سے گذرتی جا رہی ہیں۔ لیکن ہم چُپ ہیں، خاموش —— بالکُل خاموش —— اجنتا کے غاروں میں بنے ہُوئے بُتوں کی مانند —— کسی بہادر دُشمن کی گولی میرے ہیلمیٹ کو چیر کر دُوسری جانب نِکل گئی ہے۔ میرا ساتھی دم توڑ رہا ہے۔ میرا ساتھی —— میجر نریندر —— دو ایک لمحوں میں کسی بہادر کی گولی میرے سینے کو بھی چیر کر نکل جائے گی اور پھر میری رُوح بھٹکتی پھرے گی۔ وطن سے دُور —— دُور —— بہت دُور

۱

ریزے

اُسے اپنی بیوی سے محبّت تھی، اِس لئے کہ وہ جوان تھی اور اُس کی بیوی کو اُس سے نفرت تھی، اِس لئے کہ وہ بُوڑھا تھا۔ گاڑی اپنی دُھن میں بھاگی چلی جا رہی تھی۔ سردی شدّت کی تھی۔ اُس نے شیروانی کے تمام بٹن بند کر لئے۔ سگار ہونٹوں میں داب کر لائٹر سے سلگا لیا اور لائٹر بے پروائی سے بستر پر پھینک دیا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ اُس کی بیمار بیوی سامنے والے برتھ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ بستر ہی پر پڑی رہے تاکہ وہ اُس کے سوا کسی سے محبّت نہ کر سکے ——— لیکن اُسے اپنی جوان بیوی سے محبّت تھی۔

گاڑی ایک دھکّے کے ساتھ رُکی اور بستر کے کونے پر پڑا ہُوا لائٹر نیچے گر گیا۔ اُس نے لائٹر اُٹھا لیا۔ ولائیتی سگرٹ لائٹر اُس کے کھُردرے

ہاتھوں سے پھسل رہا تھا۔ وہ لائٹر کی ملائم سطح پر اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان اندر داخل ہُوا۔ نوجوان نے بستر اُوپر والے ایک برتھ پر لگوالیا اور ایک چمکتا ہُوا سِکّہ قلی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ قلی سلام کرکے باہر نکل گیا۔ اُس نے نوجوان کو ایک بار پھر گھُورا اور اُس کی اُنگلیاں تیزی سے لائٹر کی ملائم سطح پر پھسلنے لگیں۔ کھُردری، بُوڑھی، ناتواں اُنگلیاں —— ولائیتی لائٹر —— ملائم سطح —— نوجوان ہونٹوں میں سگریٹ دابے اُس کی طرف بڑھا، اُس نے نوجوان کے مانگنے سے پہلے ہی لائٹر اُس کی طرف اُچھال دیا۔ نوجوان نے سگریٹ سُلگا کر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ لائٹر لوٹایا اور اُس کی جوان بیوی کو گھُورتا ہُوا اپنے برتھ پر جاکر لیٹ گیا۔ وہ کسی چوٹ کے احساس سے تلملا اُٹھا اور اُس کی اُنگلیاں پھر لائٹر کی سطح پر پھسلنے لگیں۔ گاڑی پھر رینگنے لگی۔ گاڑی کی بڑھتی ہُوئی رفتار کے ساتھ ساتھ اُس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ بار بار نوجوان کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے آرہی تھی —— نوجوان کے ہونٹوں میں دبا ہُوا سگریٹ —— اُس کا سگریٹ لائٹر اُچھال دینا —— نوجوان کا سگریٹ سُلگا کر اُس کی بیوی کو گھُورتے ہُوئے گزرنا —— اجنبی سگریٹ، اُس کا لائٹر —— ! اجنبی نگاہیں، اُس کی بیوی —— ! بے چینی میں وہ کروٹ بدل کر بیٹھ گیا۔

نوجوان کے متعلق سوچتے ہوئے اُس نے شیشے کی کھڑکی میں اپنا عکس دیکھا۔ اُسے اپنا عکس بھدا معلوم ہوا، دھندلا سا ——— مٹتی ہوئی تصویر۔ اُس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کی بیوی کا بیمار چہرہ بجلی کی روشنی میں زرد زرد نظر آ رہا تھا۔ اُسے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ اُسے خود میں اور اپنی بیوی میں ایک مشابہت کا احساس ہوا۔ ——— خنکی کا احساس بھول کر اُس نے شیشے کی کھڑکی گرا دی۔ ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا آیا، اُسے سرد کر کے اور اُس کی بیوی کے بال پریشان کر کے گم ہو گیا۔ اُس نے اپنی بیوی کی اُس پریشان لٹ کو دیکھا، جو اُس کے رخساروں پر گر گئی تھی۔ اُس نے پھر کھڑکی چڑھا دی۔ اُس کی بیوی نے بستر سے ہاتھ باہر نکالا اور اپنے بالوں کو سنوارنے لگی۔ اُس کے جی میں آئی کہ وہ اُس کے بالوں کو سنوار دے، لیکن اُس کی انگلیاں لائٹر کی ملائم سطح پر ہی پھسل کر رہ گئیں۔ گاڑی کی کھٹ کھٹ میں ہم آہنگی تھی۔ اُس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، لیکن اُسے سونا نہیں تھا۔ اُس کی بیوی جاگ رہی تھی ——— وہ بیمار تھی ——— اور وہ ——— وہ نوجوان! ——— وہ نہیں سوئے گا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے تھرماس سے چائے پیالی میں انڈیل لی۔ چائے پیتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ مغرب کے لوگوں کے دماغ کتنے ترقی یافتہ ہیں اور ہم ہندوستانیوں سے کتنا آگے بڑھ چکے ہیں، یہ تھرماس ——— یہ سگریٹ لائٹر ——— یہ ———

اُس کے خیالات کا سلسلہ مُنقطع ہو گیا - نوجوان اپنے برتھ سے اُترا اور جُوتے پہننے لگا وہ اس کی ہر حرکت کو گھورتا رہا۔

"اُف! سردی کتنی شدید ہے" - نوجوان نے اُسے مُخاطب کیا۔

لیکن وہ خاموش رہا - کوئی جواب نہ پاکر نوجوان باتھ روم میں چلا گیا - اُسے نوجوانوں سے نفرت تھی، اِس لئے کہ وہ ہر جوان عورت کو گھورنے لگتے ہیں ——— اِس لئے کہ وہ اُس کی بیوی کو گھورنے لگتے ہیں، اِس لئے کہ وہ خود جوانی میں ایسا نہ تھا - اُس نے کبھی کسی کی بیوی کو نہ گھُورا تھا - وہ بے حد شرمیلا تھا ——— لیکن اب وہ اُکتا چُکا تھا - وہ ہر نوجوان سے کہہ دینا چاہتا تھا کہ وہ اُس کی بیوی ہے - اُسے اپنی بیوی سے محبّت ہے - کسی اور کو یُوں اُس کی بیوی کو دیکھنے کا حق نہیں - وہ اپنی بیوی کو لے کر آسمان کی سُرخیوں اور نیلاہٹوں میں گُم ہو جانا چاہتا تھا، جہاں اُسے جوان نگاہیں پریشان نہ کریں۔

اُس کی پہلی بیوی بغیر کسی اولاد کے مر گئی تھی - وہ تنہا رہ گیا تھا ——— بالکل اکیلا - اُس کی محبّت اُس کے دِل میں دبی پڑی تھی - اُس کی بیوی جوان تھی - وہ سوچنے لگا اگر کملا زندہ رہتی تو پربھا کے برابر تو آج اُس کی لڑکیاں ہوتیں - اِس نوجوان کے برابر اُس کے لڑکے ہوتے اور اُس کی اولاد ایک شفیق باپ پاکر کتنی خوش ہوتی ——— آج اُس کی جوان بیوی ہی اُس کا سہارا ہے - اُس کا سب کچھ یہی ہے - وہ

پربھا کو کسی صورت بھی گنوانے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ کسی نوجوان کا اپنی بیوی کو گھورنا برداشت نہ کر سکتا تھا۔

نوجوان کانپتا ہوا باتھ روم سے نکلا۔ اُس کی بجھی بجھی نگاہیں نوجوان کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں انکسار تھا لیکن اُس نے نوجوان کی انکسار بھری مسکراہٹ کا کوئی جواب نہ دیا۔ نوجوان اپنے برتھ پر جا کر لیٹ گیا۔ اُس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ پربھا کے چہرے پر بشاشت تھی، زندگی تھی ——— اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس نے پھر اپنی بیوی کو بغور دیکھا۔ پربھا کی نگاہیں نوجوان کے برتھ پر مرکوز تھیں .... ایک میٹھی میٹھی سی مسکراہٹ پربھا کے ہونٹوں پر اُبھرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کی بیوی ایک اجنبی کو یوں دیکھے! ——— وہ سوچتے سوچتے تلملا اُٹھا۔ اُس نے منہ پھیر لیا۔ شیشے کی کھڑکی میں اُسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ دُھندلا سا عکس، مٹتی ہوئی تصویر۔ اُسے ایک پل کے لئے احساس ہوا کہ اُس کی بیوی کو ہر نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا حق ہے۔ اِس لئے کہ وہ بوڑھا ہے، وہ اُس کی مسکراہٹ کا جواب نہیں دے سکتا، اِس لئے کہ اُس کی آنکھیں اب مسکراتی نہیں، اِس لئے کہ اُس کا چہرہ جاذبیت کھو چکا ہے ——— لیکن پربھا اُس کی بیوی ہے! ——— وہ تڑپ اُٹھا۔ اُس کی گرفت لائٹر پر مضبوط ہو گئی۔

اُس کے جی میں آرہی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے ہونٹوں سے اُس مُسکراہٹ کو نوچ کر باہر پھینک دے، تاکہ وہ مُسکراہٹ اُس کی زندگی سے دُور ہو جائے ——— دُور ——— بہُت دُور ——— وہ اُسے پیچھے چھوڑ آئے ——— اپنی زندگی سے بہُت پیچھے، ایسے ہی جیسے وہ اپنی مُسکراہٹ پھینک آیا ہے۔ سوچتے سوچتے اُس کے دِل کے کِسی گوشے سے آرزُو اُبھری کہ یہ نوجوان اُس کا بیٹا ہوتا اور پربھا اُس کی بیوی نہیں، بیٹی ہوتی۔ پھر اُسے بیوی کی ضرُورت نہیں تھی۔ اُسے زندگی کا سہارا چاہیئے تھا۔ اُس کے جی میں آئی کہ وہ اُٹھ کر پربھا کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پُوچھے: "بیٹی! اب طبیعت کیسی ہے؟" لیکن نہیں ———! وہ اپنے جذبات کو کچلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پربھا تو اُس کی بیوی ہے ———! اور یہ نوجوان! اِسے کوئی حق نہیں کہ اُس کی بیوی کو یُوں دیکھے، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ پربھا کو کوئی حق نہیں کہ وہ کِسی نوجوان کو دیکھ کر مُسکرائے۔ پربھا کی مُسکراہٹ کِسی غیر کے لئے نہیں ہے۔ وہ مُسکراہٹ اُس کی ہے، اپنی ہے۔ لیکن اُس کی مُسکراہٹ کا جواب؟ ——— اُس کا دِل بیٹھنے لگا۔ لاُئبریا پر اُس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اُس نے بُجھے ہُوئے سِگار کو پھر سُلگا لیا۔

سِگار کا کڑوا دُھواں اُس کے حلق سے اُتر کر اور دِل کو چھُو کر اُبھرا۔ دماغ اور پھیپھڑوں سے ہوتا ہُوا ناک اور مُنہ سے باہر آ گیا۔ اُس نے تین چار لمبے لمبے کش کھینچے۔ اُس کے سینے میں بلغم چھنکنے لگی۔ وہ زور زور سے

کھانسنے لگا۔ وہ کچھ لمحوں کے لئے لگاتار کھانستا رہا۔ پھر اُسے ایک دم خیال آیا کہ اُس کی بیوی بیمار ہے۔ جوان بیوی! ——— وہ کیا سوچے گی!! وہ کھانسی دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ کھانسی کے زور سے آنکھوں میں آئے ہوئے پانی کے دو قطرے اُس نے رومال میں جذب کر لئے۔ اُس نے پھر ایک ہلکا سا کش کھینچا اور دھواں منہ ہی میں رکھ کر مرغولے بنا کر اُگل دیا۔ وہ خود کو دھوکا دے رہا تھا۔ وہ اپنی جوان بیوی کو دھوکا دے رہا تھا کہ وہ کھانسی تو یُوں ہی آ گئی تھی ورنہ اُس کے پھیپھڑے بہت اچھے ہیں۔ اُس نوجوان سے بھی اچھے ہیں، جو اُوپر والے برتھ پہ لیٹا ہوا ہے۔ اُس نے خود کو دھوکا دے کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کی بیوی کی تیز تیز نگاہیں اُسے اپنے سینے میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ سہم گیا۔ اُس نے پھر پربھا کی طرف دیکھا۔ پربھا کے چہرے پر حقارت تھی۔ نفرت سے اُس کے ماتھے پر سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔ وہ یہ ہرگز نہ چاہتا تھا۔ اُس نے جان بُوجھ کر نہ کھانسا تھا۔ لیکن پربھا کے چہرے پر یہ نفرت، یہ حقارت کیوں ہے؟ ——— اِس لئے کہ وہ بُوڑھا ہے؟ ——— نہیں، پربھا ایسا نہیں سوچ سکتی۔ وہ تو اُس کی بیوی ہے۔ اُس کے جی میں آئی کہ وہ پھر پربھا کی طرف دیکھے، لیکن اُسے حوصلہ نہ ہوا۔ اُس کی نگاہیں، گاڑی کے چلنے سے ہلتی ہوئی خطرے کی زنجیر سے اُلجھ کر رہ گئیں۔ وہ سوچنے لگا۔ انسان نے اپنی ہر تخلیق کو اِس طرح ڈھالا ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے قابو میں رکھ سکتا ہے۔

یہ لائٹر، اِسے وہ جلا بھی سکتا ہے اور بجھا بھی سکتا ہے۔ یہ گاڑی، جو اپنی ہی دُھن میں بھاگی چلی جا رہی ہے، جیسے اِس میں سفر کرنے والوں سے کوئی سروکار نہیں، یہ بھی روکی جا سکتی ہے۔ اُس کے جی میں آئی کہ کاش! وہ اپنی زندگی کی گاڑی کو بھی روک سکتا۔ اُس میں بھی کوئی خطرے کی زنجیر ہوتی۔ وہ وقت کو باندھ سکتا۔ وہ پھر جوان ہو سکتا۔ لیکن نہیں! وہ تو آگے ہی آگے بھاگا چلا جا رہا ہے اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اُس کے سر میں چند کالے بال جو ابھی باقی تھے، وہ بھی سفید ہو گئے ہوں۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اُس کی روح کوئی دم کی مہمان ہو لیکن اُس کی جوان بیوی! ——— اور ابھی وہ خود بھی تو ایسا بوڑھا نہیں۔ اُس کے سر میں ابھی کالے بال ہیں۔ اُسے کچھ اطمینان سا ہو گیا۔ اُس نے سگار کا ایک ہلکا سا کش کھینچا۔ لیکن اُسے دُھواں سینے تک لے جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اُس نے ایک دم دُھواں اُگل دیا۔ دھیرے دھیرے نگاہیں خطرے کی زنجیر سے ہٹا کر وہ اپنی بیوی کے چہرے پر لے آیا۔ اُس کی جوان بیوی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر رہی تھی۔ اُسے خوشی سی محسوس ہونے لگی۔ اُسے یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ اُس کی بیوی کیوں مسکرا رہی ہے؟ اُس کی بیوی اُس نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کوئی رنگین سپنا دیکھ رہی ہے، یا وہ اُس کی کسی بات پر مسکرا رہی ہے؟ ——— اُس نے مسکراتے ہوئے تھرمامیٹر جیب سے نکالا۔ جب وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تو اُسے پارہ

گرانے کا خیال آیا۔ اُس نے تھرمامیٹر کو زور سے جھٹکا دیا۔ اُس کی نحیف، ناتواں، سرد اُنگلیوں سے تھرمامیٹر پھسل گیا۔ شیشے کے چند ننھے ننھے ریزے بکھر گئے۔ پارے کی دو چمکتی ہوئی ننھی ننھی بوندیں پھسل کر اُس کے برتھ کے نیچے چلی گئیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے مبہوت کھڑا رہا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا، لیکن اُس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اُس کی حالت ایک ستارے سی تھی، جو آسمان سے ٹوٹ کر گر رہا ہو، نیچے، نیچے ——— بہت نیچے ——— پستیوں میں، گہرائیوں میں ——— وہ چونکا۔

"یہ لیجئے تھرمامیٹر۔" نوجوان اُس کے قریب کھڑا کہہ رہا تھا۔

اُس نے خاموشی سے تھرمامیٹر اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور اپنی بیوی کے برتھ پر بیٹھ کر اُس کے مُنہ میں لگا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوجوان اپنے برتھ پر چلا جائے۔ وہ یہاں کیوں کھڑا ہے؟ وہ پھر چونکا۔ نوجوان کہہ رہا تھا ———

"ایک منٹ ہو گیا ہے، تھرمامیٹر نکال لیجئے۔"

اُس کے جی میں آئی کہ تھرمامیٹر کو گاڑی سے باہر پھینک دے لیکن وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے تھرمامیٹر اپنی بیوی کے مُنہ سے نکال لیا۔ تھرمامیٹر کو دیکھنے کے بعد اُسے مسرّت ہونے لگی۔

"ایک سَو دو۔" وہ زور سے بولا اور جلدی سے باتھ رُوم میں جا کر تھرمامیٹر دھو کر لا کے نوجوان کو لوٹا دیا۔

"شکریہ" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ نوجوان نے تھرمامیٹر اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنے برتھ کی طرف لوٹنے لگا۔

"میں نے کہا۔ اگر آپ کو سونا نہ ہو تو یہیں بیٹھ جائیے!" وہ بولا۔

نوجوان بغیر جواب دیئے اُس کے برتھ پر بیٹھ گیا۔ نوجوان نے مفلر کو ایک نئی گرہ دے کر کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے۔

"آج سردی بہت ہے اور آپ تو بہت تھوڑے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ لیجئے چائے پیجئے!" اور وہ تھرماس سے کپ میں چائے اُنڈیلنے لگا۔

چائے کا پیالہ نوجوان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ پھر بولا۔

"آپ کے پاس تھرمامیٹر ہے۔ بیمار ہے کوئی آپ کے ساتھ؟"

"جی نہیں، بیمار تو میرے ساتھ کوئی نہیں، مَیں ڈاکٹر ہوں"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

"کہاں تک جائیے گا؟"

"شملہ جا رہا ہوں۔ میرے والدین ہیں وہاں۔ اُنہیں لینے۔"

"خوب، خوب، آپ سے بھی خوب ملاقات ہوئی۔ مَیں شملہ ہی میں رہتا ہوں۔ آپ کا نام جان سکتا ہوں!"

"جی، مجھے مجید کہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب، میرا نام کدارناتھ ہے۔ یہ سگار لیجئے!"

اُس نے ایک سگار ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ پھر اُسے ایک دم

خیال آیا۔ اُس کی دِلی خوشی پر ذہن نے قابو پالیا۔ وہ سوچنے لگا مجید، مُسلمان آج کل شملہ جارہا ہے؟

"آپ شملہ جاکر اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال رہے ہیں؟" اُس کے لہجے میں پدرانہ شفقت تھی۔

"آپ کا اشارہ فساد کی طرف ہے؟"

"جی، ہاں!"

"مَیں اِن باتوں سے بالاتر ہُوں۔ مُجھے کسی سے نفرت نہیں ہے مَیں تو دِق کے مریضوں سے بھی محبّت کرتا ہُوں۔ پھر کِسی کو مُجھ سے نفرت کیوں ہونے لگی؟" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

اُسے یُوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا اپنا بیٹا کِسی خطرے میں پڑ رہا ہو، اُسے بے چینی سی محسُوس ہو رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ سو جائیے۔ ابھی تو سفر بہُت باقی ہے، یہ لیجئے کمبل، سردی بہُت ہے۔" وہ الفاظ بہت مُشکل سے ادا کر پا رہا تھا۔

ڈاکٹر خاموشی سے کمبل لے کر اپنے برتھ پر جا کے لیٹ گیا۔

اُسے ایک عجب سے اضطراب کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں بار بار خطرے کی زنجیر سے اُلجھ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کاش! وہ اِس گاڑی کو واپس دہلی لے جاسکتا۔ یہ نوجوان اپنے والدین کو بچانے

شملہ جا رہا ہے! لیکن جب وہ شملہ پہنچے گا تو اُس کی بہنوں کی عصمت لُٹ چکی ہوگی۔ اُن کی جوان چھاتیوں کو کاٹا جا چکا ہوگا ——— اور اُس مکان کی گندی نالیوں میں اُن کی لاشیں سڑ رہی ہوں گی، وہ مکان ایک کھنڈر ہوگا ——— جس مکان میں جوان دِلوں نے سپنوں کے حسین محل بنائے ہوں گے ——— اُس کے جی میں آ رہی تھی کہ وہ مجیدہ سے کہے کہ وہ گاڑی سے چھلانگ لگا کر جان دے دے، خودکشی سے بڑا گناہ اپنی بہنوں کی لُٹی ہوئی عصمت کو دیکھنا ہوگا ———

اُس نے بے مقصد لائٹر جلا دیا۔ اُس کے جی میں آ رہی تھی کہ وہ سارے کمپارٹمنٹ کو آگ لگا دے۔ گاڑی بھاگتی رہے۔ ہوا کے تُند جھونکوں سے آگے بڑھتی جائے اور جب گاڑی کو ڈرائیور کھڑی کر دے گا تو لوگوں کا ایک ہجوم اُس کے کمپارٹمنٹ کی طرف اُمڈ آئے گا ——— تو صرف تین انسانوں کی راکھ اور ہڈیاں ہوں گی ——— تین اِنسانوں کی ——— نہ وہ ہندو ہوں گے، نہ مسلمان ——— صرف تین اِنسان!

اُس کے حواس کا توازن بگڑ رہا تھا ——— وہ کیا سوچنا چاہتا تھا اُسے بھی معلوم نہ تھا۔

اُس کی نگاہیں ہر چیز کو چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ خالی برتھ ——— باتھ رُوم کا دروازہ ——— شیشے کی بند کھڑکیاں، جن میں کمپارٹمنٹ کی مختلف چیزوں کے دُھندلے عکس نظر آ رہے تھے۔ اُس کی بیوی۔

کمپارٹمنٹ کے فرش پر ٹوٹے ہوئے تھرمامیٹر کے بکھرے ہوئے ریزے مسکرا رہے تھے۔ وہ اُن چمکتے ہوئے ریزوں کو کچھ دیر گھورتا رہا۔ پھر اُسے ایک دم تھرمامیٹر کا ٹوٹنا یاد آگیا۔ تھرمامیٹر کا ٹوٹنا! ——— بدشگونی!! اُس کی بیوی ——— وہ اُسے گنوانے کے لئے تیار نہ تھا۔ نوجوان! ——— نہیں، نہیں!! ——— گاڑی کی ٹکر ہو جائے گی!!! ——— اُس کے بوڑھے حواس کا توازن بگڑ گیا۔ سگار کا بُجھا ہوا ٹکڑا نیچے پھینک کر اُس نے بوٹ سے مسل دیا۔ اُس نے ایک نیا سگار ڈبیے سے نکالا اور نوکیلی طرف سے ذرا سا دانت سے کاٹ کر پھینک دیا اور لائٹر جلا کر سُلگا لیا۔ اُس کی نگاہیں سگار کے دُھوئیں کے فضا میں تحلیل ہونے کا انتظار کر کے پربھا کے چہرے پر گڑ گئیں۔ اُس کی بیوی اُس کی طرف تک رہی تھی۔ نگاہیں نگاہوں سے ملیں۔ وہ کسی اور طرف دیکھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کی بیوی بولی۔

"آپ چُپ بیٹھے ہیں کیا بات ہے؟"

"یونہی" اُس نے ایک اور کش کھینچ کر دُھواں اُڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا جی گھبرا رہا ہے"۔ اُس کی بیوی نے کسی ہمدردی کے جملے کی اُمید کرتے ہوئے کہا اور مسکرا دی۔

اپنی بیوی کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر اُس کے دل میں کسی جذبے نے انگڑائی نہ لی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اُسے یوں

محسوس ہو رہا تھا، جیسے کسی نے اُسے آدھی رات کو شمشان میں جلتی ہوئی چِتا کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہو۔ وہ کسی اَن جانے خوف سے کانپنے لگا۔ اُسے اپنے گرد کی تمام فضا میں نحوست بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ماحول سے بے نیاز سگار کا دھواں اُڑا رہا تھا۔ وہ بھول رہا تھا کہ اب سے کچھ دیر پہلے وہ کیا تھا۔ اب اُسے اِس بات کی پروا نہ تھی کہ اُس کی بیوی کی مُسکراہٹ اُس کے لئے ہے یا کسی اور کے لئے۔ ڈاکٹر کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ آکر مِٹ رہی تھی۔ اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹر اُس کا اپنا بیٹا ہو ——— اُس کے اپنے خُون سے بنا ہوا۔

یکایک گاڑی کے پہیّے چیخے اور گاڑی کسی اَن جانے مقام پر رُک گئی۔

"ہائے!"

"میں مَر گیا!!"

"مجھے مت مارو!!!"

"میرے اللہ!!!!"

بُہت سی چیخیں اُس کے کانوں سے ٹکرائیں۔ اُس نے شیشے کی کھڑکی گرا کر باہر دیکھا، پولیس کا ایک افسر ٹارچ کی روشنی کر کے ریزرویشن چِٹ پڑھ رہا تھا۔ چاندنی میں تلواریں چمک رہی تھیں۔ گولیاں چل رہی تھیں اور کئی چیخیں، عورتوں، مردوں، بچّوں کی فضا میں گونج رہی

تھیں۔

فساد!

بلوائی!!

بوڑھوں، عورتوں اور معصوم بچوں کا خون!!!

وہ یکبارگی کانپ اُٹھا۔ اُس کے جسم کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔ اُس کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور وہ شخص جو باہر ریزرویشن چِٹ پڑھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ریوالور لئے اندر داخل ہُوا۔

"ڈاکٹر مجید کون ہے؟"

"مطلب ______؟"

"گاڑی پر حملہ ہوگیا ہے اور ہم لوگوں کو اپنی حفاظت میں لے رہے ہیں۔"

اُس نے ہاتھ سے سوئے ہوئے مجید کی طرف اشارہ کر دیا۔ اُس شخص نے مجید کو جگایا، لیکن مجید کسی حفاظت میں جانے کے لئے تیّار نہ تھا۔ لیکن اُس کے کہنے پر ڈاکٹر دروازے کی طرف چل دِیا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلنے کو تھا تو پولیس کے افسر کے ریوالور سے گولی نکلی اور مجید کے سینے سے پار ہو گئی اور وہ اوندھے مُنہ گاڑی سے باہر گِر پڑا۔ وہ شخص کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

وہ خُود پر قابُو پانے کی کوشش کرتا ہُوا اپنے برتھ پر آکر گِر گیا۔ اُس

پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

جب اُسے ہوش آیا تو کلکتہ میل تیزی سے اپنی منزل کی طرف بھاگتی جا رہی تھی، اُس نے سگار سلگانے کے لئے لائٹر ہاتھ میں اٹھایا۔ اُس کی اُنگلیاں لائٹر کی ملائم سطح پر پھسلنے لگیں ——— کھُردری، بُوڑھی، ناتواں اُنگلیاں ——— اُس کی نگاہیں اپنی بیوی کی نگاہوں سے ملیں اور اُس کی آنکھوں کے خُشک چشموں سے پانی بہہ نکلا ——— اُسے یُوں محسُوس ہو رہا تھا، جیسے اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا گنوا دیا ہو ——— اور بجلی کی روشنی میں ٹُوٹے ہُوئے تھرمامیٹر کے ننھے ننھے ریزے چمک رہے تھے، مُسکرا رہے تھے +

خالی بوتل

سِکھ ہونا بھی گناہ ہے، مجھے اِس کا احساس پہلی مرتبہ ہُوا، جب وہ ردّی کاغذ، بوتل، ٹین والا کباڑی ہر مکان کے سامنے آوازہ لگاتا ہُوا میرے مکان کے سامنے بھی آگیا۔ مَیں بدقسمتی سے دروازے ہی میں کھڑا تھا جب وہ میری نظروں کے سامنے آیا تو اُس نے ایک دفعہ پھر زور سے پُکارا۔ "ردّی کاغذ، بوتل ٹین والا" لیکن اِس مرتبہ "بوتل" پر زیادہ زور تھا۔ پہلے بھی ہوتا ہوگا، لیکن مَیں نے کبھی اِس طرف توجّہ نہیں کی۔ اُس روز تو پان کھا کھا کر سڑے ہوئے دانتوں والا کباڑی بضد معلوم ہوتا تھا کہ صاحب ہم تو "بوتل" لے کر ہی جائیں گے۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "صاحب! خالی بوتل ہوگی؟" گویا ایک سِکھ کے پاس "خالی بوتل" کا ہونا لازمی ہے۔ مَیں بہت ہی سٹ پٹایا کہ یہ کمبخت ضرور میری پارسائی کی قلعی

کھول دے گا۔ اب اِدھر خانم بھی متوجہ ہو گئیں اور ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اُن کے شوہر کی عزّت اور پارسائی کا سوال تھا اور اگر وہ جواب نہ دیتیں تو پڑوسنیں کب ماننے والی تھیں؟ کھُسر پھُسر کرنے لگ جاتیں۔ اُنہوں نے کڑک کر پنجابی اُردو میں فرمایا "جا وے بھائی ساڈے گھر میں بوتل ووتل نہیں"۔ جان بچی، اور ایسے نازک موقع پر میں سکھ ہوتے ہوئے بھی لاحول پڑھ دیا کرتا ہوں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مذہب میرے نزدیک بے معنی سی چیز ہے۔ "بے معنی" کچھ موزوں نہیں۔ صحیح تر الفاظ میں "ڈھونگ" ہے۔ عیسائیت کا مفروضہ ہے کہ زمین ساکن ہے اور سُورج اس کے گرد گھومتا ہے لیکن گلیلیو نے اس مفروضے کو پاش پاش کر دیا۔ اگر کچھ اور گلیلیو پیدا ہو جائیں تو یقیناً اور بہت سے مذہبی ڈھونگ ختم ہو سکتے تھے۔ خیر ہو جائیں گے، جلدی کا ہے کی ہے! مجھے کہنا یہ تھا کہ میں کسی مذہب کا قائل نہیں۔ ہاں تو بوتل کی بات ہو رہی تھی۔ اُس بے وقوف کباڑی کو کون سمجھاتا کہ شریف آدمی بوتل ووتل گھر نہیں لایا کرتے۔ ہوٹل یا کسی سنیما کی بار ہی میں بس یہی چار پانچ پیگ پی کر ایک آنے کی الائچی سے منہ کی بُو مٹا کر گھر آ جاتے ہیں، لیکن یہ ہندوستانی، ان میں تو عقل کی بُو بھی نہیں ہوتی۔ ویسے سب ہی ہندوستانی بے وقوف نہیں ہوتے۔ مجھی کو دیکھ لیجئے۔ اچھا خاصا عقلمند——

خیر مجھے چھوڑیئے میرے چچا جان ہی دیکھ لیجئے۔ ماشاء اللہ اچھے خاصے عقلمند، پاکباز قِسم کے آدمی ہیں۔ اُن کی سمجھ بُوجھ! ——— ایک ہی مثال دے دُوں تو ماننا پڑے گا آپ کو۔ جیسا کہ میں آپ کو بتا چُکا ہُوں میرے چچا بُہت پاکباز ہیں۔ بس یُوں سمجھ لیجئے، اِس بات کے قائل "جان چلی جائے پر دھرم نہ جائے" اور یہ تو آپ مانتے ہی ہیں کہ ہم ہندوستانیوں کے بے شمار مذہب شیشے سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں، جو ذراسی کوتاہی پر خطرے میں پڑجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میری طرف کوئی شخص سنیما میں یا گاڑی میں سگریٹ کا دھواں غلطی سے چھوڑ دے تو میرا مذہب تو یقیناً خطرے میں پڑجائے گا۔ اب دیکھئے مجھے کسی "خطرے" کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جب میں کسی کڑی نظر کو "خطرے کا احساس" نہ ہونے پر اپنی پگڑی اُچھالتے دیکھتا ہُوں تو مجھے مجبُوراً مذہب کو خطرے میں ڈالنے والے صاحب سے درخواست کرنی پڑتی ہے۔" اجی صاحب! یہ بیڑی کا دھواں ——— میرا مطلب ہے، دُوسری طرف کو ———" میری بدقسمتی کہ میں زندگی کے ہر موضُوع میں تیسرے درجے پر ہُوں۔ گاڑی میں تھرڈ کلاس، سنیما میں نو آنے اور دفتر میں چپڑاسی کے بعد میرا ہی رُتبہ ہے، یعنی کلرک۔ ——— دھوئیں کے رُخ کو بدلنے کی درخواست پر بیڑی پینے والے حضرت جواب دیتے ہیں۔" ابے او سردار دھونس مت دیجیئو۔ گاڑی کسی کے باپ کی نہیں۔ آں ———!" اور پھر بیڑی کا ایک لمبا کش۔ کڑی نظر والے صاحب

پھر اشارہ کر دیتے ہیں کہ ثبوت دے دو اپنے "سکھ" ہونے کا۔ اب یہ میرے ایسے "قلم مار" کے بس کا روگ نہیں اور میرے چچا مجھے ہمیشہ کوستے رہتے ہیں کہ "یہ لڑکا بگڑ گیا ہے۔ مذہب کوئی چیز نہیں! یہ ضرور خاندان کی ناک کٹوائیگا۔" خیر یہ تو چچا جان کہتے ہیں، لیکن ابھی میرا قطعاً ارادہ نہیں ہے کہ خاندان کی ناک کٹوائی جائے۔ میں اپنے چچا جان کے عقلمند ہونے کی دلیل پیش کر رہا تھا۔ میرے چچا اچھے "خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ اب تو ریٹائر ہو چکے ہیں، لیکن کبھی پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے محکمے میں اوورسیر تھے۔ آپ نے بھی دیکھا ہو گا ——— یہ سکھ ہمیشہ فوجی، لاری ڈرائیور یا اوورسیر ہی ہوتے ہیں۔ چچا جان کو تنخواہ کے علاوہ "بالائی یافت" خوب تھی۔ مثلاً ایک جگہ صرف دس مزدور کام کر رہے ہیں۔ اور یہ وہاں پندرہ دکھائیں گے۔ پہلے تو پانچ قلیوں کی تنخواہ جیب میں۔ پھر ہر قلی کو اپنی اٹھارہ روپے تنخواہ سے دو روپلے دینے پڑتے۔ وہ زمانہ اور تھا۔ مزدوری کہاں ملتی تھی اور نہ دو روپے "کمیشن" بہت معنی رکھتا تھا۔ غرضکہ ایسے ہی بہت سے حربے استعمال ہوتے اور اُن کی آمدنی سُکھ چین کے دنوں میں، میرا مطلب ہے اس مہنگائی کے زمانے سے پہلے پانچ، چھ سَو روپے ماہوار تھی۔ یہ تو صرف اُن کی ذہانت کا ثبوت ہے اور اب سُنئے پاکبازی کی دلیل۔ ہمارے چچا جان کے مکان میں پُوجا پاٹھ کے لئے ایک کمرہ مخصوص ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے چچا صُبح تو پُوجا پاٹھ نہیں کرتے، لیکن رات کو کھانا کھانے سے پہلے اس

فرض سے ضرور سبکدوش ہوں گے۔ یہ پوجا پاٹھ کا کمرہ ہمیشہ مقفل رہتا ہے چچی سے کئی مرتبہ پوچھا، لیکن ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ "چابی تمہارے چچا اپنے پاس ہی رکھتے ہیں"۔ ہم نے سوچا کہ چچا جان سوچتے ہوں گے، بال بچوں کا گھر ہے۔ کمرہ کھلا رہا تو مقدّس کتابوں کی بے حرمتی کریں گے، اس لئے کمرہ بند رکھتے ہوں گے۔ ایک دن اتفاق سے مجھے کسی کام کے لئے شام کو چچا جان کے یہاں جانا پڑا۔ چچی تو باورچی خانے میں تھیں اور پوجا پاٹھ کے کمرے میں کچھ شیشے کھنکھنانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دل میں سوچا۔ یہ خاموشی، کوئی شلوک سنائی نہیں دے رہا، اور یہ آواز کیسی؟ ایک دراز میں سے جھانک کر دیکھا تو چچا جان بوتل سامنے رکھے پی رہے تھے۔ میں دیکھتا رہا۔ انہوں نے بوتل کا کارک بند کر کے دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک بڑی مقدّس تصویر کے پیچھے رکھ دی اور دھوپ جلا کر مسکراتے ہوئے کچھ گنگنانے لگے۔ خدا جانے کوئی شلوک تھا یا "میں تو تم کے خُم لنڈھا دوں"۔ کہہ رہے تھے، اور میں بھول گیا کہ چچا جان یہ کیا حرکت کر رہے ہیں، اور جی میں آئی کہ دروازہ ایک دھکّے سے توڑ کر اندر چلا جاؤں اور چچا کی پیٹھ ٹھونک کر کہوں "جیو چچا، جیو!! لیکن یہ اکیلے اکیلے کیوں؟ لاؤ نا ذرا ہم بھی تو چکھ کر دیکھیں!" لیکن یہ نامراد ادب مانع آگیا اور میں پھر دُبک کر صوفے میں دھنس گیا۔ یوں تو شملہ میں ہمیشہ ہی بے حد سردی ہوتی ہے، لیکن اُس دن سردی معمول سے زیادہ تھی اور پینے کو جی چاہ رہا

تھا۔ مَیں نے چچا جان کے "پُوجا پاٹھ" کے بعد باہر آنے پر درخواست کی۔ "چچا جان، زکام ہو گیا ہے۔ برانڈی ہو گی تھوڑی سی؟" تو فرمانے لگے "برانڈی ورانڈی میرے یہاں کہاں سے آئے گی؟ مَیں نے نوکری ضرور کی تھی، لیکن آبکاری کے محکمے میں نہیں ——— قُدرت کو وقت دو۔ یہ ہر بیماری کا بہترین علاج ہے۔"

جی میں آئی کہ چچا سے مؤدّب ہو کر پُوچھوں کہ جناب یہ اندر کیا ہو رہا تھا؟ اور اُس تصویر کے پیچھے کیا دھرا ہے؟ جسے آپ مقدّس کہتے ہیں؟ لیکن خُود کو سنبھالنا پڑا۔ کہاں محترم چچا جان اور کہاں میں! اب دیکھیے ہمارے چچا جان تو ایسے پاکباز ہیں اور ہماری خانم کہ غریب کباڑی ہی پر طبع آزمائی کر دی، حالانکہ درونِ پردہ ہم بھی کبھی کبھار تھوڑی سی پی لیا کرتے ہیں۔ یُونہی دوا کے طور پر۔

نہ جانے حقیقت سے ہر شخص مُنکر کیوں ہو جاتا ہے؟ اور اگر میرے ایسا کوئی اعتراف بھی کرتا ہے کہ صاحب مَیں کسی مذہب کا قائل نہیں، مجھے خُدا کی ہستی پر بھی شک ہے، اگر خُدا ہے تو یقیناً بُوڑھا ہو چکا ہے اور اِس ترقی کرتی ہُوئی دُنیا کو سنبھالنا اُس کے بس کا روگ نہیں، تو لوگ پاگل سمجھنے لگتے ہیں اور کئی ایک "پاکباز" تو گالیاں بھی دے دیتے ہیں، لیکن مَیں اِن باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ یہ لوگ مذہب مذہب کی رٹ لگاتے ہیں، اور مَیں سمجھتا ہُوں کہ اِنسان اور تہذیب یافتہ ہونا سب سے بڑا

مذہب ہے۔ مسلمان بھی انسان ہیں اور میرے بیشتر دوست مسلمان ہی تھے۔ اِس لئے کہ اُن میں انسانیت کی بُو تھی۔ ہندو اور سکھ اگر اِن میں انسانیت ہے تو مجھے اِن سے بھی محبّت ہے۔ لیکن میرے ہم مذہب میرے اِس نظریئے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اکثر بلکہ بیشتر کا خیال ہے کہ میں بدل جاؤں گا یعنی .... لیکن یہ بات قطعاً نہیں ہے۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ ہندو، مسلمان یا سکھ ہونا ہی مذہب ہے، انسانیت اور تہذیب کچھ مختلف چیزیں ہیں تو ایسا مذہب ہمیں نہیں چاہیئے۔ میں مذہب کا منکر اور باغی ہی اچھّا ——— اوہ! میں اپنے محترم چچا جان کی تعریف کرتے کرتے کہاں پہنچ گیا۔ سن سنتالیس کی بات ہے، میں اُن دنوں شملہ میں تھا، جب فساد شروع ہوئے۔

سیفؔ اور میں بچپن سے ساتھ کھیلے۔ پھر ساتھ کالج میں پڑھے اور ساتھ ہی آل انڈیا ریڈیو میں مُلازم ہو گئے۔ سیفؔ میرا بچپن کا ساتھی تھا۔ مجھے اُس سے بہت محبّت تھی۔ ہم پالیٹکس، ادب غرضکہ ہر بات میں ہم خیال تھے۔ سب سے بڑی مناسبت مجھ میں اور اُس میں یہ تھی کہ اُسے قرآن مجید کی ایک بھی آیت یاد نہ تھی اور میں تو سِرے ہی سے کورا ہوں۔ مجھے چند فلمی گانوں کے سوا تُلسی داس جی کا ایک بھجن بھی یاد نہیں ہے میرا گلا ذرا سُریلا ہے یعنی اچھّا خاصا گا لیتا ہوں اور اِس افسانہ نگاری سے پہلے میں شُدھ سارنگ اور تلک کاموو ہی سیکھا کرتا تھا، ایک مرتبہ ایک

صاحب گوردوارے میں زبردستی گھسیٹ کر لے گئے، بالکل زبردستی۔ کبھی اِن گھسیٹنے والے" صاحب نے ہمیں گنگناتے سُن لیا ہو گا۔ دو ایک بھجن ہونے کے بعد درخواست کر دی کہ مَیں بھی کوئی بھجن سُناؤں۔ بے وقُوف آدمی! ٹھُمری، ٹھپّا، دادرہ، غزل یا بھیرویں کہتے تو مَیں گلا پھاڑ دیتا، لیکن بھجن!۔۔۔۔ کوئی یاد ہوتا تو بات تھی۔ مجھے مقدّس جگہ پر بیٹھے ہُوئے بھی جھُوٹ بولنا پڑا۔ "اجی گلا خراب ہے اور۔۔۔" خیر جھُوٹ اکارت نہیں گیا اور مَیں صاف بری کر دیا گیا۔ اور ہمارے چچا جان کو دیکھئے کہ اُن گھسیٹنے والے صاحب سے فرمانے لگے۔ "لے جاؤ جی اِسے، سویرے سویرے اُٹھتے ہی کان کھانے لگ جاتا ہے۔۔۔۔ رات کٹتی ہے گِن گِن تارے" ۔۔۔۔۔ اب دیکھئے مَیں جھُوٹ بھی کیا کہتا تھا۔ خانم اپنے ابّا کے یہاں تھیں، تو راتیں تارے گنتے ہی کٹتی تھیں۔

آپ کی دہلی میں تو جلی، سُوکھی ہوٹل کی روٹیوں کے سِوا کچھ میسّر نہ ہوتا تھا، لیکن جب ہم شملہ گئے تو سوچا ذرا صحّت ٹھیک کر لی جائے اور یہ کچھ بُرا خیال بھی نہ تھا۔ ہم نے صُبح سَیر کرنے کا معمول بنا لیا۔ اِدھر سیف اور اُس کے گھر والوں کو بحفاظت لاہور بھجوانے کے جُرم میں ہمیں کئی الٹی میٹم مِل چُکے تھے اور صُبح سویرے اکیلے باہر جانے سے ڈر بھی لگتا تھا، چچا جان کو بھی اِس کا احساس تھا۔ اُنہوں نے ارشاد فرمایا کہ سَیر کو جاتے ہُوئے کرپان لے کے جایا کروں۔ اب کہاں مَیں، کہاں ستار، کہاں قلم اور کہاں تلوار! بہت

ہی پریشانی ہوئی اور دِل نے کہا بچہ جی اپنی حفاظت تو کیا کرو گے، کوئی اُلٹا قصہ پاک کر دے گا۔ لیکن چچا جان کا حکم اور مجھ میں ہمت نہ ہوئی کہ اُن کا حکم ٹال دوں۔ گزشتہ شام کو کئی وارداتیں ہو چکی تھیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی صبح سیر کو جاتے ہوئے میں اپنے سے دو فٹ ساڑھے گیارہ اِنچ چھوٹی یعنی تین فٹ کی کرپان بغل میں داب کر لے گیا۔ لوٹتے ہوئے جب شانکلی اور گھبر کے درمیان پہنچا تو دیکھا کہ چار سردار جی ننگی کرپانیں لِئے دو مسلمانوں کو گھیرے کھڑے ہیں۔ میں نے کرپان کمبل میں چھپا کر نیچی نگاہیں کئے پاس سے گذرنے کی کوشش کی ——— چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے آواز سنائی دی "خالصہ جی!" میں سمجھا کسی نے کہا ہے۔ ہالٹ! اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو گردن جُدا۔ گھبراہٹ میں کرپان ننگی ہو گئی۔ وہ لوگ مجھے ساتھ کے موڑ کے پیچھے لے آئے۔ پہلے تو کرپان کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ کر تعریف فرمائی گئی، پھر حکم ہوا کہ "چھ" یعنی بسم اللہ میں ہی کروں۔ اُن کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی میں نے عرض کیا کہ صاحب یہ خون خرابہ میرے بس کا نہیں، تو ایک صاحب نے کوٹ سے مصالحے دار مالٹے کی بوتل نکال کر کہا۔ تھوڑی سی پی لو، حوصلہ ہو جائے گا۔ میں نے اِس پر بھی انکار کر دیا تو ایک صاحب بولے کہ اِن کی کرپان ہی سے کر دو، اِن کا نام تو شہیدوں میں ہو جائے گا میں نے اِس پر بھی احتجاج کیا اور درخواست کی کہ آپ لوگ اپنے نیک ارادے

سے باز آجائیے لیکن کون سنتا تھا۔ اُلٹے وہ مجھ پر ہنسنے لگے "یہ تو سکھ نہیں چڑیا کا بچّہ ہے"۔ لیکن جب موڑ سے لوٹ کر دیکھا تو شکار غائب اور سردار صاحبان مجھے دو موٹی موٹی گالیاں دے کر چلے گئے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما گئے کہ "بچّہ جی سکھ ہو، نہیں تو تمہارا ابھی کام تمام کر دیا جاتا"——
ایسی کسی اور بسم اللہ سے بچنے کے لئے میں خانم کو اس کے والد کے گھر سے لے اور بغل میں داب کر دہلی بھاگ آیا——

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

لیکن یہ دیکھئے! یہ بدتمیز کباڑی آج بھی چلّا رہا ہے "ردّی کاغذ، بوتل والا!" اسے کون سمجھائے کہ شریف آدمی گھر بوتل ووتل نہیں لایا کرتے۔ لیکن اُف، دیکھئے! یہ اب بھی اسی طرح چلّا رہا ہے "بابو! خالی بوتل!"

لٹی ہوئی بہاریں

وقت کی بات ہے، اور وہ وقت ہی ایسا تھا کہ بھائی بہن کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ باپ بیٹی کو چھوڑ کر چلا گیا ــــــ بھائیوں اور ماؤں کے سامنے اُن کی بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں لوٹ لی گئیں ــــــ ماؤں کی گودوں سے چھین کر معصوم بچوں کو نیزوں پر اُچھال دیا گیا ــــــ روز اخباروں کی سرخیاں نئی آگ لگا دیتیں۔ آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگوں میں اشتعال بڑھتا جا رہا تھا ــــــ ہر گھڑی، ہر پل، ہر دل میں یہی خوف لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب اور کس طرح اُسے بھی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے ــــــ سڑکوں پر، مکانوں میں، نالوں میں جا بجا لاشیں سڑنے لگیں ــــــ غریب بے گناہ لوگوں کی لاشیں ــــــ مندروں کے کلس چمکتے رہے، مسجدوں کی بُنیادیں مُستحکم رہیں ــــــ لیکن اُن کے

پجاری کٹ کٹ کر مر گئے ــــــ لاشوں کو کتے اور گدھ کھانے لگے ــــ یہ بھی انسانی عظمت اور وقار کی ایک تصویر تھی ــــــ وقت کی بات ہے اور وہ وقت ہی ایسا تھا ــــــ

تارے ڈوب چکے تھے اور رات کی سیاہی ڈھل چکی تھی ــــــ کار تیز چلانے کا حکم دے کر خان صاحب اونگھ رہے تھے ــــــ ڈرائیور کی بغل میں اُن کا داماد، اختر بیٹھا تھا، جو شاید پریشانی کے باعث سو نہ سکتا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک کونے میں اُن کی بیٹی نجمہ، مریم کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی، سنجیدہ ــــــ ! درمیان میں بیگم تھیں، جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد آہیں بھر رہی تھیں ــــــ خان صاحب شملہ چھوڑ کر جا رہے تھے ــــــ انسان انسان سے ڈر کر بھاگ رہا تھا ــــــ بھائی، بھائی سے ڈر کر بھاگ رہا تھا ــــــ !

کار نے ایک جھٹکے سے موڑ کاٹا تو خان صاحب چونک پڑے اور اُن کی نظریں اپنی نئی کوٹھی پر جم گئیں، جو انہوں نے پچھلے ہی سال بنوائی تھی ــــــ جو دور ایک پیلے دھبے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ کار پہاڑی کے دوسری طرف گھوم گئی۔ خان صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"رحمٰن! کتنی دور آ گئے ہوں گے ہم؟"

"یہی قریب تین میل!"

"صرف؟"

"حضور! گاڑی آٹھ، دس میل کی رفتار سے زیادہ چلانا ناممکن ہے۔ آپ نے موڑ تو دیکھے ہی ہیں، کتنے خطرناک ہیں۔ ذرا سی بے پروائی سے کار ہزاروں فیٹ نیچے کھڈ میں گر جائے گی ——"

ایک موڑ آ چکا تھا۔ رحمٰن نے پھرتی سے موڑ کاٹا اور خان صاحب نے گردن اونچی کر کے کھڈ میں جھانکا —— میل بھر کی عمودی ڈھلان دیکھ کر خان صاحب کانپتے ہوئے سیٹ میں دبک گئے۔

سب اپنے اپنے خیالوں میں غرق تھے۔ خان صاحب نے اُس اداس خاموشی کو محسوس کیا۔ اُن کا جی چاہتا تھا کوئی بات کہیں، لیکن انہیں خود محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اُن کی زبان سی دی ہو —— کار سانپ کی طرح بل کھائی ہوئی سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ رحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے اُنہیں احساس ہوا کہ وہ بہت بے پروائی سے ڈرائیو کر رہا ہے۔ انہوں نے پھر رحمٰن کو مخاطب کیا۔

"رحمٰن! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"جی؟ —— جی!" —— اور اُن کی نگاہیں تارکول کی سیاہ سڑک پر پھسل کر موڑ پر آئے ہوئے پہاڑ سے ٹکرا کر رہ گئیں۔

خان صاحب سوچنے لگے، قدرت نے انسان کو زندہ رہنا، جینا

کس کس طرح سمجھایا ہے۔ جیسے اس موڑ پر ابھی پہاڑ آگیا تھا، ایسے ہی زندگی کے موڑ پر بھی ایک پہاڑ آگیا ہے۔ اس موڑ کے بعد جیسے یہ کشادہ سڑک ہے شاید ایسے ہی زندگی میں آئے ہوئے انقلاب کے اس موڑ کے بعد بھی ایک حسین، کشادہ مستقبل ہو، یا پھر عمیق گہرائیاں ـــــــ پستیاں ـــــــ اس ڈھلوان کی سی پستیاں جن سے ابھرنا ناممکن ہے ـــــــ انہوں نے سب کے چہروں کا جائزہ لیا۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کی اور انہیں احساس ہوا کہ سب کے دل ودماغ پر خوف مسلّط ہے۔ انہوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پیشانی پر ابھری ہوئی سلوٹوں کو محسوس کر کے انہوں نے دروازے سے شیشہ سرکا دیا اور باہر جھانکتے ہوئے اپنے خیالات کو منتشر کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں پر برانس کے سرخ پھول کسی کی پامال حسرتوں کی طرح، مجروح سی مسکراہٹ کی مانند کھلے ہوئے تھے، دور، دور تک وادیوں میں دیودار کے اونچے اونچے درخت تھے اور افق پر سرخی پھیل رہی تھی۔ ایک نیا آفتاب ابھر رہا تھا، ایک نئی صبح کا پیغام لے کر ـــــــ

خان صاحب دیر تک ان ابر پاروں کو دیکھتے رہے جو افق کے قریب ہونے کے باعث سرخی میں نہائے ہوئے تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ یہ شہابی ابر پارے ان کی امیدوں کی مانند ہیں، وقت نے جن کا خون کر ڈالا ہو اور جو اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے زندگی کے افق پر نظریں جمائے

دم توڑ رہی ہوں۔ اُن کی مایوس نگاہیں خلا میں گھورنے لگیں۔

"کیا بجا ہے؟" بیگم کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

"ساڑھے چھ!" انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا ——

"کالکا کے بجے پہنچیں گے؟"

"قریب دس بجے۔"

خان صاحب نے بیگم کی نگاہوں کا تارکول کی سڑک پر پھیلنے تک تعاقب کیا اور پھر بول اُٹھے۔

"بیگم! اِس وقت ہم صبح کی چائے پیا کرتے تھے۔ مَیں سفر میں بھی اِس وقت کی چائے نہیں چھوڑا کرتا تھا۔"

"تمہیں چائے کی پڑی ہے، مَیں سوچتی ہوں جان بچ جائے۔ جوان بیٹی ہے۔ پھر اختر اور ہونے والا ننّھا ——!"

خان صاحب نے نجمہ کی طرف دیکھا جو سینڈل کی نوک سے کار کا فرش کرید نے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نجمہ بیٹی، تم کچھ گھبرائی ہوئی سی معلوم ہو رہی ہو؟"

"جی، نہیں، ابّا!"

"بیٹی، زندگی میں ایسے دن آیا ہی کرتے ہیں۔ جو شخص کہ مُصیبتوں کا مُقابلہ کرتے ہیں، وہ مر کر بھی جی جاتے ہیں اور جو مُصیبتوں سے گھبرا جاتے ہیں اُن کی زندگی موت سے بھی بدتر ہے ——" انہوں نے کہہ تو دیا

لیکن اُن کا اپنا دل ڈوب رہا تھا۔ ایسے ہی جیسے کوئی اپنے عیب چھپا کر دُوسرے کو نصیحت کر رہا ہو۔ اُن کے اپنے دِل میں احساس کی سُوئیاں چُبھ رہی تھیں۔

"ابّا کہنے کو تو بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ لیکن وقت پڑنے پر دِل قابُو میں نہیں رہتا ـــــــ" نجمہ نے ایسی نظروں سے خان صاحب کی طرف دیکھا، جیسے اُن کے دِل میں اُتر جانا چاہتی ہو۔

خان صاحب اپنے چہرے پر اُبھرے ہُوئے گھبراہٹ کے تأثرات کو چھُپانے کے لئے باہر جھانکنے لگے۔

برانس کے درخت تھوڑی دیر کے بعد سڑک کے کنارے آتے اور سُرخ پھُول بڑھتے ہُوئے اُجالے میں نکھرتے جا رہے تھے کبھی کبھی کوئی درخت سڑک کے بالکل ساتھ آ جاتا تو شبنم سے دُھلی ہُوئی سُرخ پتّیاں یوں معلُوم ہونے لگتیں جیسے کسی جوان لڑکی کے رُخساروں پر رونے کے بعد آنسُو چمک رہے ہوں ـــــــ اُنہوں نے سوچا، جیسے نجمہ کے رُخساروں سے آنسُو بہہ کر گر رہے ہوں۔

"نہیں، نہیں، مَیں نجمہ کو رونے نہیں دُوں گا" وہ بڑبڑائے۔

"کیسے رونے نہیں دو گے؟" بیگم بولیں۔

"کچھ نہیں ـــــــ مَیں، مَیں یُونہی ـــــــ کچھ نہیں!" اور وہ اُسی طرح باہر دیکھتے رہے۔ اُن کی نظر ایک سنگِ میل سے ٹکرائی لکھا تھا ـــــــ

"کالکا پچاس میل۔"

"اختر، ہم چھ میل آ گئے ہیں!"

"ابھی پچاس میل باقی ہیں اور پھر گاڑی کا سفر!" اختر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

خان صاحب کے دل پر ایک چوٹ پڑی۔ انہیں اختر سے ایسے جواب کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ تو اختر کو بہت حوصلہ مند نوجوان سمجھتے تھے اور اسی کے کہنے پر انہوں نے سفر کا یہ خطرہ مول لیا تھا۔ ورنہ کپتان صاحب تو کہہ رہے تھے۔ "خانصاحب میں آپ کا بھائی ہوں۔ نجمہ میری بیٹی کی طرح ہے۔ زندگی بھائیوں کی طرح رہتے گذار دی ہیں آپ کے لئے سر کی بازی لگا دوں گا" —— لیکن اختر کے اصرار پر انہیں شملہ چھوڑنا ہی پڑا تھا اور اب اختر ہی اتنا گھبرایا ہوا ہے —— ! خانصاحب کا جی چھوٹ گیا۔ ان کے جذبات نفرت میں بدل گئے۔ ان کے جی میں آئی کہ اختر کو چلتی کار سے دھکا دے دیں۔ اتنا پست حوصلہ نوجوان؟ ——

انہوں نے نجمہ کی طرف دیکھا۔ جو خاموش بیٹھی تھی —— وہ سوچنے لگے کہ آج پہلی بار ان کی بیٹی اور بیوی یوں بے پردہ گھر سے نکلی ہیں۔

"کیسا وقت آ گیا ہے!" انہوں نے دھیرے سے کہا اور سب نے ایک ساتھ سرد آہ بھری۔

"کتنی عجیب بات ہے —— جس سرزمین کی خاک تلے ہمارے

آبا و اجداد دفنائے گئے، جہاں ہم پیدا ہوئے، جس سرزمین کو ہم ماں کہتے تھے، آج ہمیں وہاں زندہ رہنے کا بھی حق نہیں ——— اب اجنبی جگہ، اجنبی ماحول ہمارا وطن ہوگا ——— جہاں کی مٹی سے ہماری آنے والی نسلوں کو بھی محبت نہیں ہو سکتی ——— اگر نجمہ کی جگہ میرا بیٹا ہوتا تو مَیں اس کا خون بھی بہتا دیکھ لیتا، لیکن شملہ نہ چھوڑتا ———" اور انہوں نے مایوس نگاہوں سے نجمہ کی طرف دیکھا۔ نجمہ کی خاموش آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ——— آنسو ٹپک ٹپک کر اُس کے آنچل میں جذب ہو رہے تھے، لیکن وہ ایک بُت کی مانند بیٹھی تھی۔ خاموش، ساکت، پتھر ———

"بیٹی!" ——— خان صاحب کی آواز بھرا گئی۔ اُن کی نگاہیں نجمہ کے معصوم آنسوؤں کی تاب نہ لا سکیں اور وہ پھر باہر جھانکنے لگے۔

شفق کی سُرخی گم ہو رہی تھی اور سیاہ، سفید ابر پارے اپنا رنگ دکھانے لگے تھے۔ سُورج کی شعاعیں بارش سے بھیگی ہوا کو سُکھانے لگی تھیں۔ برانس کے پھُولوں سے شبنم کی بُوندیں ٹُوٹ کر گِر رہی تھیں ———

خان صاحب کے جذبات بھٹک گئے۔ وہ بہت دیر تک خاموش رہے لیکن اُن سے خاموش نہ رہا گیا۔ وہ بول اُٹھے۔

"بیگم! دیکھو کتنا سُہانا موسم ہے۔ مٹتی ہُوئی شفق، سُورج کی نرم نرم کرنیں ——— ہوا کے جھونکے ——— آہ! مجھے زندگی کے بیتے ہُوئے دِن یاد آ رہے ہیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ مَیں اپنی کوٹھی میں بیٹھا صُبح

کی چائے پی رہا تھا۔ ایسے سہانے موسم میں تو زندگی کی لٹی ہوئی بہاریں یاد آ جاتی ہیں ——" خان صاحب ایک دم خاموش ہو گئے۔ "لٹی ہوئی بہاریں" —— اُنہوں نے اپنے ذہن میں دُہرایا —— وہ کچھ بھول جانا چاہتے تھے ——اور اب تو خدا کو یاد کرنے کا وقت تھا نہ کہ زندگی کی لٹی ہوئی بہاریں —— وہ بھلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جتنا وہ کوشش کرتے اُتنی ہی سُرعت سے اُن کے ذہن میں وہ تصویر اُجاگر ہوتی جا رہی تھی —— وہ تصویر جو اُنہیں کے ذہن میں دبی پڑی تھی۔ جسے دُنیا نے نہ دیکھا تھا —— لیکن احساس اُن کے ضمیر کو کچو کے لگا رہا تھا ——

خان صاحب نے دُزدیدہ نگاہوں سے سب کو دیکھا۔ سب اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے —— وہ اپنے ذہن میں ایک تصویر دُہرانے لگے تھے۔ لیکن وہ اِس سے بھی ڈر رہے تھے۔ شاید اِس لئے کہ دُنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر سکتے ہیں —— خواہ وہ دوسروں کے رُوبرو ہو یا خود اپنے ضمیر کے ——

"اُلفت!"

"جی سرکار!"

"کیسی ہو اُلفت؟"

"کرم ہے حضور کا —— اچھی ہوں!"

"الفت یہاں آؤ!"

"سرکار!"

"تم کتنی حسین ہو!"

"حضور!"

"رات کتنی اچھی ہے!"

"لیکن میں تو ——"

"تم اس چاندنی رات سے بھی زیادہ حسین ہو!"

"مجھے چھوڑ دیجئے —— خدا کے لئے چھوڑ دیجئے!!"

"پاگل ہو!"

"میرے پیٹ میں بچہ ہے —— میں حاملہ ہوں۔"

لیکن یہ آواز صرف کانوں سے ٹکرائی، دل تک نہ پہنچی۔

خان صاحب کروٹ لے کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ایک بار پھر سب کے چہروں کا جائزہ لیا۔ سب اپنے اپنے خیالوں میں مستغرق تھے —— انہیں ایک چور کی سی طمانیت محسوس ہوئی جو چوری کر کے بچ نکلا ہو ——

کار تارکول کی سیاہ سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی ایسا منظر آ جاتا کہ سب کی نگاہیں ایک ساتھ اسی طرف گھوم جاتیں —— خان صاحب کو ان نگاہوں کی بے کسی کا احساس ہو رہا تھا کہ یہ نگاہیں اس لئے نہیں بھٹک

رہیں کہ وہ کسی حسین منظر کی تعریف کرنا چاہتی ہیں، بلکہ —— اُن کی اپنی نگاہوں کی مانند اس لئے بھٹک رہی تھیں کہ وہ اِن مناظر کو دِل میں یادیں بنا کر سمو لینا چاہتے تھے، تاکہ آئندہ زندگی اِنہی یادوں کے سہارے کٹ سکے —— خود کو فریب دینے کے لئے اِنسان کتنا مجبُور ہے!

خان صاحب کی نگاہیں ایک سنگِ میل سے ٹکرائیں۔ وہ گیارہ میل آ چکے تھے۔ اُنہوں نے بیگم کو مخاطب کیا۔

"بیگم ہم گیارہ میل آ گئے ہیں —— اب کالکا بُہت دُور نہیں"۔

لیکن بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُنہوں نے بیگم کے چہرے کی طرف دیکھا تو اُنہیں محسُوس ہُوا جیسے بیگم کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں —— ایک دم بریک، پہیّوں سے چپک گئے۔

"رحمٰن! کار کیوں ——" فقرہ اُدھورا ہی رہ گیا —— کار کے گِرد بُہت سے نیزے مُنہ کھولے ہُوئے تھے —— بُہت سی بندوقیں آگ اُگلنے کو مُنہ پھاڑے ہُوئے تھیں —— خان صاحب بُت بن کر رہ گئے ——

"میرا بھی ایک ایسا ہی بھائی تھا" ایک نیزہ چیخا اور اختر کے سینے سے پار ہو گیا —— ایک چیخ اُبھری اور ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی۔

"شکار اچھا ہے!" ایک نیزے نے نجمہ کی چھاتیوں کو چھُوا اور چیخا ——

"باہر آجاؤ!"

"میری بھی ایک ایسی ہی بہن تھی ——" ایک نیزہ چیخا۔

"تو اسے بھی بہن سمجھ لو ——" بیگم رو دیں۔

"بڑھیا تو کسی کام نہیں آسکتی"۔ ایک نیزے کو رحم آگیا۔

"میرے پیٹ میں بچہ ہے"۔ نجمہ رونے لگی۔

لیکن یہ آواز صرف کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی، دِل تک نہ پہنچی۔

"تم نوکر ہو —— غریب"۔ ایک نیزے کو پھر رحم آگیا۔

"چلے جاؤ یہاں سے —— اور وہاں جا کر بتا دینا کہ ہم بھی انتقام لینا جانتے ہیں" —— ایک چیختی، چلاتی بڑھیا کو کار میں دھکیلتے ہوئے بہت سے نیزے چیخے ——

رحمٰن نے ایکسیلیٹر دبا دیا اور کار تیزی سے تارکول کی سیاہ سڑک پر پھسلنے لگی۔

بیگم نڈھال ہو کر سامنے کی سیٹ کی پُشت پر جھکی ہوئی تھی —— خان صاحب کی نگاہیں اختر کی پُشت پر اُس جگہ جمی ہوئی تھیں جہاں سے اختر کے جسم کا تمام خون بہہ چکا تھا —— اور نجمہ کی جگہ بیٹھی ہوئی بڑھیا سسکیوں میں کہہ رہی تھی۔

"میری بیٹی حاملہ تھی —— میری بیٹی! —— کتنی بد نصیب ہوں میں —— ایک روز جب میری بیٹی میرے پیٹ میں تھی تو مجھے لُوٹ لیا گیا تھا اور آج میری بیٹی ——"

"اُلفت!" خان صاحب کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"خان صاحب!" اُلفت انہیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی!

خان صاحب خاموش تھے۔ اُلفت خاموش تھی۔ لیکن خان صاحب کی نگاہیں خاموش ہوتے ہوئے بھی بول رہی تھیں۔۔"اُلفت، قدرت نے مجھ سے انتقام لیا ہے ـــــ میں نے تمہیں لُوٹا تھا لیکن میری بیٹی ـــــ"

اور اُلفت کی نگاہیں سوچ رہی تھیں کہ خان صاحب کو تو اُن کے گناہ کا بدلہ ملا، لیکن اُس کی بیٹی کا کیا گناہ تھا؟ ـــــ خان صاحب کی نگاہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور اُس کی نگاہیں سڑک کے کنارے پڑی ہوئی ایک عورت کی برہنہ لاش سے اُلجھ کر رہ گئیں ـــــ

محبّت

وہ مجھے دس سال بعد ملا ـــــــــ

بار کے مختصر سے کمرے میں چند خالی اور پُر کرسیوں اور دیواروں پہ کھنچی ہوئی چند تصویروں کے سوا کوئی چیز قابلِ ذکر نہ تھی۔ شراب کی تیز بُو کمرے کی فضا میں تیر رہی تھی۔ ایک عجیب خاموشی ہر سُو مسلّط تھی۔ بار میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک دم احساس ہوا کہ یہاں آئے ہوئے لوگ خوشی اور مسرّت کی جستجو میں نہیں پیتے بلکہ کچھ ایسا بھول جانے کے لئے ایسا ـــــــ جس نے اُن کے چہروں سے جوانی کا رنگ چھین لیا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ حال اور مستقبل سے بے نیاز ہیں، اُن کے ذہنوں پر صرف ماضی کا تسلّط ہے۔ وہاں قہقہے نہیں تھے ـــــــ ہنسی کا ترنّم نہیں تھا ـــــــ بیکسی تھی ـــــــ بے کس سکوت!

وہ کونے کی ایک میز پر بیٹھا تھا ——— اُس نے اپنا جُھکا ہُوا سر اُٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور پھر نظریں جُھکا لی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے دس سال پہلے کا جاوید آگیا تھا۔ مَیں اُس کی میز کی جانب بڑھ گیا تھا میری موجودگی کے احساس کے باوجود اُس نے نگاہ اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا، سر کے اُلجھے ہُوئے بالوں سے اُس کی شخصیّت بہت پُراسرار معلوم ہو رہی تھی ———

"جاوید ——— !" مَیں دھیرے سے بولا تھا۔

"مَیں نے تُمہیں دیکھ لیا تھا ———" اُس کی مُسکراہٹ میں بناوٹ تھی۔

"مَیں بیٹھ سکتا ہُوں؟"

"اِس کا انحصار مجھ پر نہیں اور اگر ہے تو مَیں کہوں گا کہ مَیں نے ابھی خود کو اِس حد تک نہیں سمجھا ———"

مَیں بیٹھ گیا تھا۔ اُس کی نگاہیں پھر جُھک گئی تھیں، مجھے یُوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ شراب کے پیالے میں، شراب کے رنگ میں کچھ پڑھ رہا ہو۔

گہری خاموشی تھی۔ مَیں خاموشی سے گھبرا رہا تھا، اُس بے کس سکُوت سے ———

"تم نے مجھے پہچانا ———؟" مَیں نے اُسے مخاطب کیا تھا۔

"ہوں!"

میں اُس کے اِس مختصر سے جواب اور اُس کے اِس رویّے پر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی سنجیدگی سے الفاظ میرے گلے میں گھُٹ کر رہ گئے تھے۔

دس سال پہلے کے جاوید میں کتنا فرق تھا۔ دس سال پہلے کا جاوید ایک ہنس مکھ نوجوان تھا۔ اُس کی باتوں میں اپنا لینے والی ایک کشش ہُوا کرتی تھی لیکن، آج کا جاوید کتنا بدل چکا تھا؟ جب اُس نے ڈگری لی تھی جبھی سے اُس کی باتوں میں سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی، وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "میَں زندگی کو سمجھنا چاہتا ہُوں ——— زندگی کیا ہے؟" اور مَیں اُس کی باتوں پر ہنس دیا کرتا تھا۔ مَیں اُس کی باتوں کا مذاق اُڑا کر کہا کرتا تھا۔ "عُمرِ خیّام کی رُباعیاں پڑھا کرو، میرے فلسفی!" لیکن، آج کے جاوید سے مجھے کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

وہ پیالے میں اور شراب اُنڈیل رہا تھا۔ مَیں نے پھر کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ بہت سے لوگ جا چکے تھے، لیکن ایسی خاموشی کے ساتھ کہ ماحول کی سنجیدگی ذرا بھی برہم نہیں ہُوئی تھی۔ مجھے محسُوس ہو رہا تھا کہ آنے والے چند لمحوں میں میرے سامنے کسی گہرے راز کا انکشاف ہونے والا ہے، اور جاوید کی شخصیّت کا بوجھ مجھے اپنے ذہن پر محسُوس ہو رہا تھا۔

"کوئی اور چیز منگواؤں؟" ——— مَیں نے سکوت کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔

"رَم سے تیز تو شاید کوئی شراب نہیں ہوتی ——؟" وہ بولا تھا —— لیکن مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بُت کو قوّتِ گویائی مِل گئی ہو۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا تھا ——

"تُم کیا پیو گے؟"

"بہت دیر میں خیال آیا!" مَیں نے چٹکی لینے کی کوشش کی تھی۔

"مَیں سوچ رہا تھا" اُس کا مختصر سا جواب تھا اور مجھے ایک دم خیال ہُوا تھا کہ یہ شخص پاگل ہو گیا ہے۔ اُس نے بَیرے کو آرڈر دیا تھا اور جہاز رانوں کے پینے کی رَم کی بوتل میز پر پڑی تھی۔

"تمہیں دَس سال بعد دیکھا ہے —— اِتنے عرصہ تک کہاں رہے ہے؟"

"آوارہ گھُومتا رہا ——"

"مَیں سمجھا نہیں ——"

"آوارہ گھُومتا رہا —— مِصر کے اہرام اور اجنتا کے غاروں سے لے کر طوائف اور شراب تک ——"

"اِس کا حاصل؟"

"مَیں زندگی کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہُوں —— مَیں زندگی کو سمجھنا چاہتا ہُوں کہ زندگی کیا ہے؟"

"کیا یہ حماقت نہیں ہے کہ تُم ایک شاندار مُستقبل کو ٹھکرا کر یُوں آوارہ، بے سرو سامان پھر رہے ہو؟"

وہ جواب میں صرف مسکرا دیا تھا، یوں جیسے میں کوئی بچہ تھا —— ناسمجھ۔ کچھ دیر تک خاموشی سے پینے کے بعد وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ —— بل کے پیسے میز پر چھوڑ کر وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا تھا —— لیکن، اپنے پیچھے اسرار چھوڑ گیا تھا —— ان بوجھ پہیلیاں —— !

دوسری ملاقات ایک ریسٹورانٹ میں ہوئی تھی۔ میں اور تبسم چائے پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ایک مسکراہٹ سے مجھے مخاطب کیا تھا —— اس کے کوٹ اور پتلون پر جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے لیکن وہ پہلی ملاقات کی طرح سنجیدہ نہیں تھا۔

"ہیلو، جادوگر!" میں نے اپنی نشست سے ذرا اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا تھا۔

"ہیلو!" کہتے ہوئے وہ خالی کرسی میں دھنس گیا تھا اور اس کی آنکھیں تبسم کی آنکھوں میں گڑ گئی تھیں۔

"یہ ——"

"تبسم آفتاب!" —— اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"بہت خوب!" —— کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی، اس چمک میں جادو تھا —— سحر —— جس سے میں اور تبسم مسحور ہو گئے تھے۔

وہ جب کی بات تھی کہ میں اور جاوید کالج میں پڑھتے تھے اور اچانک تبسم بھی ہمارے کالج میں آگئی تھی، تبسم کے آنے سے جاوید کی زندگی یکسر بدل گئی تھی اور چند ہی دنوں میں وہ بھی اپنی وہ سنجیدگی، جو لے کر آئی تھی کھو بیٹھی تھی، وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے تھے، میں نے اکثر انہیں جھیل پر دیکھا تھا ——

سینما، پکنک، دریا پر —— کالج کے ہر لڑکے کی زبان پر جاوید اور تبسم کی محبت کی داستان تھی لیکن چند ہی دن میں جاوید کی طبیعت میں ایک انقلاب آگیا تھا، اُس نے اپنے مضامین فلسفہ اور نفسیات سے بدل لئے تھے، اُس کی طبیعت میں سنجیدگی بڑھتی چلی گئی تھی لیکن جب وہ تبسم سے ملتا تو وہ بدل جاتا تھا۔ وہ اُس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا اور تبسم کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنا بدل گیا تھا۔ ڈگری لے لینے کے بعد، تبسم کے والدین نے جاوید کی نسبت طے کرنا چاہی تھی تو تبسم، جاوید کا جواب سُن کر حیران رہ گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ کم از کم چار پانچ سال شادی نہیں کر سکتا۔ میں اُس روز تبسم کے یہاں موجود تھا جب جاوید نے کہا تھا کہ وہ اپنے نصب العین کو نہیں ٹھکرا سکتا۔

"تم مجھے نہیں چاہتے؟" تبسم نے پوچھا تھا۔

"تم نے مجھے سمجھا نہیں۔ مجھے اب بھی تم سے اُتنی ہی محبت ہے جتنی کبھی تھی، لیکن میں ابھی شادی نہیں کر سکتا، اِس لئے کہ میں ابھی نوکری

نہیں کرنا چاہتا ——"

"آخر کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں خود نہیں جانتا ——" اُس نے ایک معصوم بچے کی طرح جواب دیا تھا۔

اس کے بعد دو سال تک تبسم نے جاوید کا انتظار کیا تھا، لیکن جاوید لاپتہ ہو گیا تھا، وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکی تھی، تھوڑے ہی دن میں اُس کی طبیعت سے جاوید کی چاہ کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اور اس سعی کو سہارا دینے کے لئے وہ اکثر ناچ میں جایا کرتی تھی۔ وہ اپنی شاموں کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھتی۔ اُس نے خود کو دھوکا دے لیا تھا اور پھر وہ میری زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور اب تبسم، مسز تبسم آفتاب تھی ——

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے!" جاوید نے مجھے چونکا دیا تھا۔

"آپ کے لئے شراب منگواؤں؟"

"میں نے شراب چھوڑ دی ہے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اتنی جلدی؟"

"ہاں! اس لئے کہ میں نے شراب کو سمجھ لیا ہے اور میں ہر اُس چیز کو جسے سمجھ لیتا ہوں، چھوڑ دیتا ہوں۔ میں نے بیجان چیزوں کو، بتوں کو پڑھ لیا ہے اور اب انسانوں کو، جانداروں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں ——"

تبسّم خاموش تھی۔ مجھے اُس کی خاموشی ناگوار گذر رہی تھی اور مَیں نے اپنے خیالات کو دُوسری طرف منتقل کرنے کی کوشش میں پھر جاوید کو مخاطب کیا تھا۔

"یُوں معلوم ہوتا ہے، جیسے، تُم کہیں قُلی کا کام کر رہے ہو؟"

"یہ پہلی مرتبہ نہیں۔ مَیں مصر میں مزدُوری کر آیا ہُوں —— دریاؤں پر پُل باندھتے ہوئے مزدُوروں کے ساتھ بھی اور اب اِسی شہر میں جہاں تُم جیسے لوگ جانتے بھی ہیں کہ میرے پاس فلسفے کی ڈگری ہے مَیں ایک فیکٹری میں مزدُوری کر رہا ہُوں ——"

اُس نے بیرے کو بُلا کر چائے کا آرڈر دیا تھا اور چند لمحوں کے بعد جب چائے میز پر آگئی تھی تو اُس نے چائے بناتے ہُوئے کہا تھا۔

"بھئی معاف کرنا مَیں صرف اپنا ہی بِل ادا کر سکوں گا —— آج کل میری آمدنی بہت قلیل ہے ——"

"کیسی فضُول سی بات کرتے ہو۔"

"یہ مَیں بہتر سمجھ سکتا ہُوں۔"

مجھے اُس کی موجُودگی ناگوار محسُوس ہو رہی تھی تبسّم کی سنجیدہ نگاہوں سے مَیں محسُوس کر رہا تھا کہ وہ اپنا ماضی دُہرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے یُوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے ذہن میں دبی ہُوئی یادوں کو کُرید رہی ہو —— وہ تصویریں جن میں دوبارہ رنگ نہ بھرا جا سکے گا ——

ایسے نقوش جو مٹ چکے تھے اور جو پھر نہیں اُبھر سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی، تبسّم اُن یادوں کو کرید رہی تھی۔

"جاوید! آج کل کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"مجھ سے کچھ کہا ہے؟" وہ چونک پڑا تھا۔

"آج کل کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟" میں نے بے دلی سے دُہرایا تھا۔

"کہیں، نہیں، سمجھ لو لیکن، ہاں! مجھے جگہ بہت پسند ہے۔"

"تم اگر پسند کرو تو میرے یہاں ٹھہر سکتے ہو۔"

"شکریہ! میں بہت سکون سے ہوں۔ جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں، وہاں مجھے پڑھنے کے لئے بہت وقت مل رہا ہے ——"

"اب بھی پڑھ رہے ہو؟"

"میں آج کل لاطینی سیکھ رہا ہوں۔"

"لیکن اِس سب کا حاصل کیا ہوگا؟"

"یہ میں بھی نہیں جانتا۔" اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا پھر کچھ وقفے کے بعد اُس نے کہنا شروع کیا تھا ——

"میں زندگی کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ زندگی اور موت کو! —— میں خود کو سمجھنا چاہتا ہوں اور جس روز میں خود کو سمجھ لوں گا، میں پھر زندگی کیلئے لوٹ آؤں گا ——" وہ خلا میں گھورنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ اُس کی

سنجیدگی کم ہوتی چلی گئی تھی۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے تبسّم کو مخاطب کیا تھا——

"مسز آفتاب! میں آپ کے خیالات کو پڑھ رہا ہُوں۔ آپ کچھ نہ سوچیں تو بہتر ہوگا——" اور تبسّم چونک پڑی تھی۔

"اوہ! میں سوچ رہی تھی کہ آپ وقت رائیگاں گنوا رہے ہیں—— کیا خُوب ہوتا اگر آپ اِن اُلجھنوں کو جھٹک دیتے اور پھر آپ کو کالج میں فلسفے کے پروفیسر کی جگہ تو مِل ہی رہی تھی، مَیں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا——" اور جاوید نے تبسّم کو ٹوک دیا تھا۔

"بہتر ہوگا آپ خاموش رہیں۔ مَیں جانتا تھا آپ سب کچھ کہہ دیں گی—— اچھّا! مجھے اجازت دیجئے!!" اور وہ بِل کی قیمت میز پہ چھوڑ کر ہوٹل سے باہر نکل گیا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد تبسّم چونک پڑی تھی جیسے نیند سے جاگی ہو۔

اُس روز کے بعد تبسّم کبھی نہیں مُسکرائی۔ مجھے اپنے ذہن پر بھی جاوید کی باتوں کا بوجھ محسُوس ہوتا تھا۔ یُوں معلُوم ہوتا تھا جیسے تبسّم کی آنکھوں میں ایک بھیانک خواب دَب کر رہ گیا تھا۔ وہ اکثر خاموش رہتی تھی——

تیسری اور آخری مُلاقات پر وہ میرے یہاں موجود تھا——

قریب ایک سال غائب رہنے کے بعد نہ جانے وہ یکایک کہاں سے آگیا تھا؟

جب میں شام کو دفتر سے گھر لوٹا تھا تو وہ تبسم سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ایک سال پہلے کا جاوید نہیں تھا ——— وہ بہت اچھے کپڑوں میں ملبوس تھا۔

"میں نے نوکری کر لی ہے۔" وہ تبسم سے کہہ رہا تھا۔

"نوکری؟" تبسم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"ہاں! فلسفے کا پروفیسر ہوں۔"

"یہ تو بہت پہلے بھی ہو سکتا تھا۔"

"نہیں، یہ اب ہی ہو سکتا تھا۔"

"پھر ہم شادی بھی کر سکتے تھے ———"

"تبسم!" وہ چونک پڑا تھا ——— "تبسم! تم نے ابھی تک اس بات کو بھلایا نہیں؟ ——— شادی ہی ایک ایسا راستہ نہیں جس سے محبت زندہ رہ سکتی ہے۔ مجھے آج بھی تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کبھی تھی۔"

"جاوید تمہیں میرا کوئی خیال نہیں ——— تمہیں ———"

"تبسم! میں آج ہی اس شہر سے جا رہا ہوں ———" اس نے تبسم کو ٹوکا تھا ———

اور وہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں بالکونی میں کھڑا اسے دیکھتا رہا

تھا ــــ وہ چلا گیا تھا، لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے جاوید کو نہیں خود کو گنوا دیا ہو۔

تبسم اب بھی میری زندگی میں ہے ــــ ویران تبسم ــــ لیکن آج میں سوچتا ہوں کاش! میں دُوسروں کو سمجھ لیتا۔ اِس لئے کہ اگر میں دُوسروں کو سمجھ لیتا تو شاید میں تبسّم سے اِتنا دُور نہ ہوتا جِتنا میں خود سے دُور ہوں۔

شکنیں

گرد و غبار کا ایک تیز جھکڑ آیا۔ اُس کی سکرٹ (SKIRT) کو تارا چودھری کے منی پوری ناچ کے انداز میں گھما کر اور لِپ پر گرد کی ایک تہہ جما کر گزر گیا۔ دھوپ کی تمازت سے اُس کے تمام جسم سے پسینہ اُبل پڑا تھا۔ پیشانی سے گرد اور پسینہ پونچھتی ہوئی وہ بڑبڑا دی۔

"اُنہہ نانسینس!"

پارک کے کونے میں ٹھنڈی جگہ ایک بنچ ڈھونڈ کر وہ بیٹھ گئی۔ پرس سے شیشہ اور لپ سٹک نکال کر اُس نے ہونٹوں پر سُرخی کی ایک تہہ جما لی۔ بالوں کو اُنگلیوں سے سنوار کر وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور دھوپ کی تمازت سے جھلسی ہوئی گھاس پر چلتی ہوئی سڑک پار کر کے ایک سستے ریسٹورانٹ میں جا کر بیٹھ گئی۔ بیرے کا انتظار کرتے ہوئے اُس نے

گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ پانچ بجے تھے۔ آج وہ گھر سے جلدی نکل پڑی تھی اس لئے کہ اُس کے پرس میں صرف پانچ روپے کا ایک ہی نوٹ باقی رہ گیا تھا۔ اُسے شام سات آٹھ بجے تک کوئی گاہک ملنے کی اُمید نہ تھی۔ اور اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اُس نے ناحق خود کو اُلجھن میں ڈالا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ یہ دو تین گھنٹے کیونکر گذارے گی؟ بیرے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"آرڈر دے دیا میم ساب؟"

"نہیں، ایک بوتل بیئر اور ایک پلیٹ شامی۔" اُس نے اپنے لہجے کو زیادہ سے زیادہ ولائیتی بناتے ہوئے جواب دیا۔

سامنے دیوار پر لگے ہوئے شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اُس نے بیئر اور ایک پلیٹ شامی کے بل کا اندازہ کیا۔ دو روپے کی بیئر اور بارہ آنے کی شامی اور چار آنے "ٹپ" ——— کُل تین روپے۔ پانچ روپے کے نوٹ سے دو روپے بچنے کا خیال اُسے پُر تسکین محسوس ہوا۔ وہ سوچنے لگی اگر اُسے یہاں کوئی گاہک نہ ملا تو وہ آسانی سے انڈیا گیٹ جا سکے گی۔ ایک سرسری سی نظر دوڑا کر اُس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ چند میلے کچیلے آدمی اور عورتیں بھدی سی مسکراہٹ بکھیر رہے تھے۔ اپنے گورے چٹے چہرے کا عکس شیشے میں دیکھ کر اُسے ایک طرح کی برتری کا احساس ہوا اور اُسے ریسٹورانٹ کے ماحول سے

گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگی ——— کتنا اچھا ہوتا اگر پنکی اور ٹومی یہاں رہتے! وہ دن کتنے اچھے تھے جب گاہک ڈھونڈنے کے لئے اُسے یُوں کناٹ پلیس کے چکّر نہیں لگانے پڑتے تھے اور اب تو صرف کالجوں کے چھوکرے ہی رہ گئے تھے، جو دس روپے اور ایک ڈنر سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے۔

"دس روپے، ایک ڈنر۔" وہ بڑبڑا دی۔ لیکن آج اُسے اتنا بھی بہت کافی محسوس ہو رہا تھا، کیونکہ چند منٹ بعد اُس کے پرس میں صرف دو روپے باقی رہ جانے والے تھے کبھی وہ دو روپے روز کے تو سگرٹ پھونک ڈالتی تھی اور آج دو روپے ———؟

بیئر کی بوتل کا کارک اُڑا کر اور شامی کی پلیٹ میز پر رکھ کر بیرا چلا گیا۔ شامی ختم کر کے وہ بیئر پینے لگی۔ بیئر کا کسیلا ذائقہ اُس کے ہونٹوں سے چپکنے لگا اور اُس کی پلکیں بیئر کے ہلکے ہلکے خمار سے بوجھل ہونے لگیں۔ اُسے سگریٹ کی خواہش محسوس ہوئی اور اُس نے سگریٹ بھی منگوا لئے۔ بل ادا کر کے وہ ریسٹورانٹ سے باہر نکل آئی۔

سگریٹ انگلیوں میں دبائے ہُوئے اُس نے کناٹ پلیس کا ایک چکّر لگایا۔ کئی لوگوں نے اُسے گھورا، لیکن وہ اُن کی نگاہوں سے، اُن کے دیکھنے کے انداز سے بھانپ گئی کہ اُن میں سے کسی ایک میں بھی بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ بیئر کے خمار سے اُس کے ذہن سے کئی اُلجھنوں

کا بوجھ اُٹھ چکا تھا۔ کناٹ پلیس کا ایک اور چکر لگانے کا خیال اُسے فضول سا محسوس ہوا اور وہ ڈویکو ریسٹورانٹ کے سامنے پارک میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ سڑکوں پر لگے ہوئے برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے، سامنے ڈویکو ریسٹورانٹ میں مسکراتی ہوئی روشنیوں اور اُن قمقموں کے درمیان پھیلا ہوا اندھیرا دبیز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک اپنے اور ریسٹورانٹ کے درمیان پھیلی ہوئی تاریکی کو گھورتی رہی۔ ریسٹورانٹ میں بجتے ہوئے آرکیسٹرا کی آواز اُس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ وہ بھی گنگنانے لگی اور وہ سوچنے لگی، رونالڈ اِس دُھن کو کتنا پسند کرتا تھا؟ رونالڈ کے متعلق سوچتے ہوئے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے کئی جانے پہچانے چہرے گذرنے لگے۔ اُن لوگوں کے چہرے جو اُس کی زندگی میں آ چکے تھے تصویریں اُس کے ذہن پر اُبھر اُبھر کر مٹتی گئیں اور پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ شام آ کر ٹھہر گئی، جو بھولنے کے لئے نہیں تھی۔

آج وہ پارک کے ایک اندھیرے کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں سڑک پر لگے ہوئے برقی قمقموں کی زرد روشنی بھی نہ پہنچ سکتی تھی اور اُس شام وہ بھی ناچ میں شامل تھی۔ ایک وہ شام تھی، جب اُس کا حسین پیکر رونالڈ کے بازوؤں میں لپٹا ہوا بال روم میں تھرک رہا تھا اور ایک یہ شام تھی جس میں کوئی رنگینی نہیں تھی، کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ اُس شام رونالڈ اُس کے لئے محض ایک گاہک تھا۔ لیکن اُسے خبر نہیں تھی کہ وہ

اُس کی زندگی کی آخری رُومانی شام کا گاہک تھا اور اگر اُسے یہ معلوم ہوتا تو شاید وہ اُس شام کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنانے کی کوشش کرتی، لیکن اُس کے لیئے تو وہ ایک سپاہی تھا۔ ایک گاہک جو اپنی بیوی سے کوسوں دُور ــــــ مستقبل کے تصوّر سے گھبرایا ہُوا چند لمحے اُس کے جسم کی لطافتوں سے لُطف اندوز ہو کر اپنی پریشانیوں کو شراب کے خُمار میں گُم کر دینا چاہتا تھا۔

"ہیلو ڈیرِی!" کسی نے پیچھے سے پکارا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا ــــــ وہ جولیَس تھا۔ اُسے نہ جانے جولیَس سے کیوں نفرت تھی؟ حالانکہ وہ دُوسرے عیسائی لڑکوں کی طرح سُوکھا سُکڑا سیاہ فام نہ تھا۔ وہ دولتمند تھا۔ اُسے اُس سے محبّت تھی لیکن وہ خود اِس گریز کا باعث سمجھنے سے قاصِر تھی۔

"بال رُوم چلو گی؟" وہ اُس کے قریب کھڑا مُسکرا رہا تھا۔

"نہیں!" اُس نے بغیر سوچے وہی پُرانا جواب دُہرا دیا، جو نہ جانے وہ اُسے کِتنی مرتبہ دے چکی تھی اور مُنہ پھیر لیا۔ ایک سرد آہ بھر کر جولیَس آگے بڑھ گیا اور اُس کا سایہ تاریکی میں گُم ہو گیا۔ اُسے کچھ سکُون سا محسُوس ہُوا اور وہ پھر رونالڈ کے متعلق سوچنے لگی۔ اُس کے ذہن پر اپنی زندگی کی آخری رُومانی شام کے نقُوش اُبھرنے لگے۔

* * * * *

سردی شدّت کی تھی اور جب وہ فلم دیکھ کر سنیما ہال سے باہر نکلی تھی تو وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ خنکی کا احساس کم کرنے کے لیئے وہ بار کی طرف بڑھ گئی تھی۔ بار میں بہت سے سپاہی شراب پی رہے تھے اور بے ہنگم آوازے گونج رہے تھے۔ اُس نے بار میں جانا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ اِس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ایسے ہی موقع پر جب وہ بار رُوم میں چلی گئی تھی، تو وہاں بیٹھے ہوئے تمام سپاہی اُس پر جھپٹ پڑے تھے اور رَم کے تیز نشے میں اُس کے جسم سے گوشت ہاتھوں اور دانتوں سے نوچنے لگے تھے۔

"شیری شمپین کاکٹیل پلیز"۔ اُس نے بار کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے بیرے کو آرڈر دیا۔

رونالڈ نشے میں میز پر بیٹھا ہوا گا رہا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن رونالڈ کی آواز نے اُسے اپنی نگاہیں اُس پر مرکوز کرنے پر مجبور کر ہی دیا تھا اور پھر اُس نے ایک سرسری نظر سے ہر چہرے کا جائزہ لیا تھا۔ یُوں جیسے اُسے اُن سپاہیوں سے نفرت ہو۔ اِس لئے کہ اُس روز اُس کا پرس آج کی طرح خالی نہ تھا لیکن نفرت کا احساس ہوتے ہی اُسے یُوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اُس کے بدن پر کے کپڑے تک چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوں کہ ہم وہی نوٹ ہیں جو ایسے ہی سپاہیوں کی جیبوں سے نکلے ہوئے ہیں ہمیں نفرت سے نہ دیکھو۔ ہم ارمان ہیں کسی کے کِسی کے ارمانوں کو مت ٹھکراؤ۔ کچھ بھولی ہوئی یادوں کو اپنے ذہن میں دُہرا کر

اُس نے مُسکراتے ہُوئے ایک نظر اُن سپاہیوں کی طرف دیکھا تھا اور سپاہی آوازے کسنے لگے تھے۔ آج وہ چاہتی تھی کہ اُس پر آوازے کسے جائیں تاکہ اُسے اُن آوازے کسنے والوں میں کوئی گاہک بھی مِل جائے لیکن آج اُس کا پرس خالی تھا۔ پَف پسینے سے اُتر چکی تھی اور ہونٹوں پر کی سُرخی پھیکی پڑ چکی تھی ——— یہ انتظار میں ہو چکا تھا، ایک گاہک کے انتظار میں، لیکن پھر بھی ابھی تک اُسے کوئی گاہک نہ مِل سکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ لوگ کہتے ہیں کہ جوانی کبھی پیاسی نہیں رہتی۔ وہ بھی تو جوان ہے، اُس کی آنکھیں مُسکراتی ہیں، اُس کے ہونٹوں میں ابھی احساسات کا لمس باقی ہے لیکن گاہک؟ ایک آہ بھر کر وہ پھر بیتے دِنوں کے متعلق سوچنے لگی۔

کاکٹیل آ چکی تھی۔ وہ خاموشی سے پی رہی تھی اور اُس کی خاموشی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اُن سپاہیوں میں کونسا ایک رُومانی شام کا بہترین ساتھی ہو سکتا تھا؟ اور جب اُس کی نگاہیں میز پر بیٹھے ہُوئے رونالڈ پر پہنچی تھیں تو وہ میز سے اُچھل کر اُس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور دُوسرے سپاہیوں کی ہنسی گُونج اُٹھی تھی۔

"کیسی رُومانی شام ہے؟" وہ مُسکراتے ہُوئے بولا تھا۔

"ہوں۔" اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا اور ساتھ ہی بیرے نے بِل آگے بڑھا دیا تھا۔ جب رونالڈ نے بِل ادا کرنے کے لئے اپنی جیب سے بُہت سے نوٹ نکالے تھے تو وہ پگھل گئی تھی۔

"میں ادا کر دیتی"۔

"کوئی بات نہیں"۔ رونالڈ نے جواب دیا تھا اور جب وہ رونالڈ کے ساتھ باہر آ رہی تھی تو سپاہیوں نے پھر آوازے کسے تھے اور اُن آوازوں کے جواب میں انہوں نے مسکرا کر پیچھے دیکھا تھا اور باہر سڑک پر آ گئے تھے۔

"تمہارا نام؟" رونالڈ نے اُس کی کمر کے گرد بازو لپیٹاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ڈیزی"۔ اُس نے جواب دیا تھا۔

"ڈیزی! کتنا پیارا نام ہے!! تمہارا نام سُن کر تو مجھے ڈیزی کے وہ پھول یاد آ گئے ہیں جو وطن میں میرے گھر کے باغیچے میں لگے ہوئے ہیں"۔

"تمہاری بیوی تو ہو گی؟" اُس نے پوچھا تھا۔

"ہاں! لیکن کیوں؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ آج تم یہاں نت نئی لڑکیوں کے ساتھ دادِ عشرت دیتے پھرتے ہو اور تمہاری بیوی ——؟"

"آؤ اِس پارک میں بیٹھیں"۔ رونالڈ بولا تھا۔

وہ دونوں اِسی بنچ کے قریب کھڑے تھے جب رونالڈ نے اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں کس لیا تھا —— اُسے جذبات کی ایسی آسودگی ملی تھی، جو اُسے جب تک کوئی نہ دے سکا تھا۔ وہ اِسی جگہ بیٹھ

گئے تھے۔ لیکن وہ آج سی اداس شام نہ تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اُس شام کو مطمئن نہ تھی، جیسے ہر انسان حال سے مطمئن نہیں ہوتا اور جب وہ ماضی بن جاتا ہے تو وہ ایک حسین یاد بن جاتا ہے، چاہے اُس میں کتنی تلخیاں ہی کیوں نہ پنہاں ہوں۔

"تم میری بیوی کا ذکر کر رہی تھیں؟" رونالڈ نے سکوت توڑا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ رونالڈ اُسے اپنے بازوؤں میں کس لے۔

"ہاں۔" اُس نے رونالڈ کی بیوی کے متعلق سُننے کی خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی 'ہاں' میں احساسِ رازجوئی سمو دیا۔

"میری بیوی؟ ہاں، میری بیوی!! وہ بھی کسی ڈیوک کی بانہوں میں لپٹی ہوئی کسی بال رُوم میں ناچ رہی ہو گی۔ کسی کیفے میں اپنے چاہنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرا رہی ہو گی۔ کل اتوار ہے۔ کل تو میں کسی محاذ پر روانہ ہو جاؤں گا۔ جہاں بموں کے دھماکے ہوں گے اور گولیوں کی سنسناہٹ اور وہ سمندر کے کنارے کسی چاہنے والے کے ساتھ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر لیٹی ہوئی زندگی کا لُطف لے رہی ہو گی۔"

"وہ تمہارا انتظار نہیں کر سکتی؟" اُس نے ٹوکا تھا۔

"کتنی بھولی ہو تم؟ وہ تو میرا انتظار اُن چھ گھنٹوں کے لئے بھی نہ کر سکتی تھی، جو مجھے دفتر میں صرف کرنے ہوتے تھے۔ جب میں دفتر سے لوٹ کر گھر آتا تھا، تو وہ گھر میں نہیں ہوتی تھی۔ میں تمام شام اُس کا انتظار

کرتا، لیکن وہ رات گئے آتی اور جب وہ آتی تو اُس کے ساتھ شراب کے نشے میں بدمست میرے ہی بینک کا مینجر ہوتا تھا۔ شادی کے بعد کے ایک سال میں نہ جانے کتنے لوگ شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے میرے گھر پر آتے رہے اور نہ جانے کتنی مرتبہ رات گئے میں نے اُن کے لئے اپنے مکان کے دروازے کھولے۔" اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ اُسے اپنے قریب کھینچتا ہوا بولا تھا۔

"ڈیزی، زندگی کے یہ حسین لمحات اِن فضول باتوں میں ضائع نہ کرو۔ بعض آدمی، بعض باتیں محض بھول جانے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ وہ دیکھو! چاند کو دیکھو —— آج پورے چاند کی رات ہے۔ چاند ہمیں درختوں کے اِن جھرمٹوں سے یوں جھانک رہا ہے جیسے کوئی کنواری دو پنچھیوں کو چونچ سے چونچ ملاتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ اِن لمحات کو ضائع نہ جانے دو۔ کہیں کوئی بدلی چاند پر نہ چھا جائے۔" اور رونالڈ نے اُسے اپنے بازوؤں میں کس لیا تھا۔ چاند مُسکراتا رہا تھا۔ پورے چاند کی رات جوان تھی اور ہوا کے متوالے جھونکے جذبات کی آگ کو بھڑکا رہے تھے دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی تھیں اور پھر ریسٹورانٹ میں بجتے ہوئے سازوں کے نغمے کی مانند فضا میں جذب ہو کر گم ہو گئی تھیں۔

وہاں سے اُٹھ کر وہ بال رُوم میں چلے گئے تھے۔ رونالڈ کے ساتھ ناچ کر اُسے یوں محسوس ہونے لگا تھا، جیسے وہ کوئی اپسرا ہو جس

کا پیکر ہوا کے لطیف جھونکوں پر تھرک رہا ہو۔ جب وہ مسرّت کی متلاشی تھی، لیکن آج اُس کی مسرّت، خوشی، ہنسی ہر چیز کی قیمت چند سرسراتے ہوئے نوٹ تھے۔ زندگی کیسے کیسے نشیب و فراز کا نام ہے؟ ناچ کے بعد وہ پھر بار میں چلے گئے تھے۔ شیشوں میں شراب مسکرا رہی تھی اور آرزوؤں کے کنول کھلتے چلے گئے تھے۔ حسرتوں کی جلن کم ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ پھر اُسی بنچ پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ جوان دلوں کی دھڑکنیں پھر تیز ہو کر ریسٹورانٹ میں بجتے ہوئے سازوں کے نغمے کی مانند فضا میں گم ہو گئی تھیں۔

اُسے رونالڈ کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ رونالڈ نے جدا ہوتے وقت کہا تھا" ڈیزی! اگر زندگی رہی تو میں پھر بھی آؤں گا۔ تم میرے ساتھ میرے وطن چلنا۔ میرے گھر کے باغیچے میں تمہارے رخساروں کی طرح ملائم، تمہاری آنکھوں کی طرح مسکراتے ہوئے، تمہارے ارمانوں کی طرح شگفتہ ڈیزی کے بہت سے پھول ہیں"۔ اُس کے دل پر آج بھی رونالڈ کے ارمانوں کا بوجھ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کاش! اُسے رونالڈ زندگی کے کسی موڑ پر پھر مل جاتا۔ لیکن ایک سپاہی کی زندگی تو صحرا کی ریت کی مانند ہے، جو ایک بار اُڑ کر پھر اُسی جگہ آکر نہیں بیٹھتی، جہاں سے اُڑی ہو۔

* * * * * *

موٹر کے ایک تیز ہارن کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ گرجے کی گھڑی نے بھی ٹن ٹن آٹھ بجا دیئے۔

آج ایک مدّت بعد اُس کے جی میں آرہی تھی کہ وہ بھی چرچ ہو آئے، لیکن اُسے ایک دم اُس ایک روپے اور چند آنوں کا خیال آگیا جو اُس کے پرس میں باقی رہ گئے تھے۔ بیر کا خمار اُتر چکا تھا۔ اُس کی طبیعت مضمحل سی ہو رہی تھی۔ اُس کے جی میں آرہی تھی کہ وہ گھر لوٹ جائے لیکن وہ خود کو مجبور سا پا رہی تھی۔ اُس کے پاس دُوسرے دن کے لئے کچھ بھی باقی نہ تھا۔ سگریٹ سُلگا کر اُس نے چند کش لگائے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاتھ سے سگریٹ کی شکنیں دُور کرتی ہوئی وہ سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔

ریسٹورانٹ سے آرکیسٹرا کی سحر انگیز دُھن سُنائی دے رہی تھی۔ اُس کے جی میں آرہی تھی کہ وہ بھی کچھ پی لے شیری شمپئین نہ سہی، رم کا ایک پیگ ہی ہوتا۔ لیکن اُس کے پاس صرف ایک روپیہ اور چند آنے باقی رہ گئے تھے، جو رم کے ایک پیگ کے لئے بھی ناکافی تھے اور اگر اُسے یہاں کوئی گاہک نہ مل سکا تو اُسے انڈیا گیٹ بھی تو جانا تھا۔ بس کا کرایہ اور گاہک نہ ملنے کی صورت میں گھر جانے کے لئے بھی تو کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ بوجھل دل کے ساتھ وہ بس سٹینڈ کی طرف چل دی آج اُسے خود سے شدید نفرت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کب تک اس راستے پر چل سکے گی؟ کب تک اُسے گاہک ملتے رہینگے؟ اور ایک دن جب اُس کے بال اپنی رنگت کھو کر برف کی مانند سفید ہو جائیں گے تو کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ اُس نے خود

کو تسلّی دی۔ وہ سوچنے لگی ——— وہ ضرور کسی سے شادی کر لے گی، چاہے وہ کوئی کلرک ہی کیوں نہ ہو۔ وہ شادی ضرور کرے گی ——— !

بس سٹینڈ پر پہنچ کر بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی وہ بہت دیر تک، دوسری عورتوں کی طرف دیکھتی رہی۔ میلے کچیلے، پھٹے پرانے کپڑوں سے تن ڈھانکے عورتوں کو، اُن کے سیاہ، سوکھے سکڑے بچّوں کو۔ لیکن اُسے ایک کمتری کا احساس پریشان کرتا رہا، حالانکہ وہ سلک کی سکرٹ اور قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے یہ میلی کچیلی عورتیں اُس سے کہیں اچھّی ہوں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اِن عورتوں کی روزی جسم بیچنے سے تو پیدا نہیں ہوتی! اور اُن عورتوں کے متعلق سوچتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے وہ عورت ہی نہ ہو۔ اُس کے جی میں آ رہی تھی کہ وہ خودکشی کر لے، اِس زندگی سے کہیں دور بھاگ جائے، کہیں دور ——— بس اُس کے قریب آ کر رکی۔ ٹکٹ لے کر وہ بس میں بیٹھ گئی۔ بس رینگنے لگی اور وہ پھر سوچنے لگی ——— اُس کی زندگی بھی تو اِسی سڑک کی مانند ہے۔ سڑک کے اندھیرے میں موٹریں اور گاڑیاں روشنی سے اپنی منزل ڈھونڈ لیتی ہیں اور اُس کی زندگی کے اندھیرے میں لوگ چند نوٹوں کی سرسراہٹ سے اپنے جذبات کی آسودگی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اُس کی نگاہیں سامنے کے شیشوں سے جھانک کر اندھیروں، اُجالوں سے اُلجھتی رہیں اور انڈیا گیٹ آ گیا۔

بس سے اُتر کر وہ گھاس پر بیٹھ گئی۔ اُس کی نگاہیں انڈیا گیٹ کی بڑی محراب سے ٹکراتی ہوئی اوپر اُٹھ گئیں ——— چاند درختوں کے جھرمٹ کے پیچھے مسکرا رہا تھا۔ ایک رومانی شام کا چاند۔ اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ بہت سے جوان جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ سگریٹ سُلگا کر وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جارج کے بُت کے گرد بہت رونق تھی، وہ اسی طرف کو چل دی۔

"ڈیر جی!" کسی نے پیچھے سے پکارا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا وہ رمضان تھا، جو اس سے پہلے بھی اُسے کئی لوگوں کے لئے مہیا کر چکا تھا۔

"ایک گاہک ہے۔ بیس روپے دینے کو تیار ہے۔ آدھے اگر مجھے دو تو تمہیں لے چلوں۔" وہ بولا۔

اُس نے بغیر سوچے "ہاں" کر دی، اور رمضان کے ساتھ چلتی ہوئی ایک اندھیرے کونے کی طرف بڑھنے لگی۔ ایک درخت کے سائے میں جہاں اندھیرا گہرا تھا، وہ شخص بیٹھا تھا۔ اُس کے سفید بال اُس دبیز اندھیرے میں چمک رہے تھے۔

"دیکھئے کیسی چیز ہے!" رمضان بولا۔ اور جواب میں اُس شخص نے دس دس کے دو نوٹ رمضان کی طرف بڑھا دیئے۔ ایک نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما کر رمضان اندھیرے میں گم ہو گیا۔ اُس نے نوٹ پرس میں رکھ لیا اور ....

بھٹکے ہوئے جذبات کے جھونکے آئے اور گذر گئے

"تمہارا نام ؟" وہ شخص بولا۔

"ڈیزی" اُس نے جواب دیا۔

"ڈیزی بہت پیارا نام ہے" اُس نے کہا۔

—— "کل پھر ملنا۔ یہیں پر"۔ اور وہ شخص مسکراتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔

وہ جواب میں خاموش رہی۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ کی اُنگلیوں میں سگریٹ سُلگا کر داب لیا اور دُوسرے سے سگرٹ کی شکنیں دُور کرنے لگی۔ قریب ہی سے اُس کے کانوں میں جو لیس کی جانی پہچانی آواز پڑی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

"کاش! ڈیزی میری ہو سکتی۔ مجھے اُس سے محبّت ہے، لیکن وہ دس روپے اور ایک ڈنر کے لئے خود کو بیچ کر میری محبّت کا مذاق اُڑا رہی ہے —— مجھے تم سے محبّت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک شام کے لئے خرید رکھا ہے، تاکہ میں ڈیزی کو کچھ دیر کے لئے بھول جاؤں۔ لیکن ڈیزی! وہ میری رُوح میں سما چکی ہے"۔

اُس کے کانوں میں رونالڈ کے الفاظ گونجنے لگے۔

"ڈیزی، اگر زندگی رہی تو میں پھر آؤں گا، میں ضرور آؤں گا۔ تم میرے ساتھ وطن چلنا۔ میرے گھر کے باغیچے میں تمہارے رُخساروں کی طرح ملائم"

تمہاری آنکھوں کی طرح مسکراتے ہُوئے، تمہارے ارمانوں کی طرح شگفتہ ڈیزی کے بُہت سے پھُول ہیں"۔

جولیئس اور رونالڈ ——————

اور اُسے یُوں محسُوس ہونے لگا، جیسے اُس کے رُخساروں پر اَن گِنت اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کا تنفّس رینگنے لگا ہو، جیسے اُس کے دِل کی دھڑکنیں اَن گِنت تیز تیز سانسوں تلے دب رہی ہوں اور جیسے اُس کی سکرٹ پر شِکنیں اُبھر آئی ہوں —————— وہ اَن گِنت شِکنیں جنہیں وہ آج تک مِٹا چُکی تھی، جو ایسے ہی اندھیروں میں اُبھر چُکی تھیں ؞

بال رُوم میں

ہوٹل ڈی پیلیس سے نکل کر ہم اُس سیدھی سڑک پر چلنے لگے جو پارک تک پہنچ جاتی ہے۔ شراب کے نشے میں ہمارے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف دُور تک برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ سردی کسی قدر زیادہ تھی۔ مَیں نے پال کے بازو سے بازو نکال کر کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے۔ ہمارے فوجی بُوٹوں کی بے ہنگم چرچر کے سوا فضا خاموش تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ پر پھڑپھڑاتا تو دو چار سُوکھے پتّے گر کر کچھ دیر کے لئے فضا میں جان ڈال دیتے۔

"پال!" ——— مَیں نے کہنی سے اُسے کچوکا دیا، لیکن شراب کے نشے میں اُس کے مُنہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی۔ وہ چُپ تھا ——— بالکل چُپ، اُس فضا کی مانند جس کے سکوت کو ہمارے بُوٹوں کی آواز

توڑ رہی تھی۔ اب سے کچھ دیر پہلے وہ کتنا چہک رہا تھا۔ اور اپنی اُس فرنگی محبوبہ کا ذکر کرتے ہوئے تو اُس کے رُخسار کسی قدر تمتما گئے تھے۔

معمول کے مطابق ہم بار میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ پال بے محابا پیئے جا رہا تھا۔ ہوٹل کے وسیع ہال میں آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ تقریباً ہر میز پر دو ایک عورتیں بیٹھی تھیں۔ سب لوگ تلخیوں میں مٹھاس ڈھونڈ رہے تھے، قرار ڈھونڈ رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مرد اور عورت شراب کے نشے میں بدمست ہو کر ناچنے لگتے۔ میری اور پال کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور ٹکرا کر رہ جاتیں۔ پال ایک سرد آہ بھرتا اور کہہ اُٹھتا۔ "تم نہیں جانتے ہیلین کتنی خوبصورت ہے! اُس کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے ہیں جیسے اُس سامنے پڑے ہوئے بلّورین ساغر میں شراب مچل رہی ہے ——— ہیلین تُم ———" وہ ہر نئی آنے والی عورت کی طرف لپک پڑتا۔

سامنے والے میز پر بیٹھا ہوا فرانسیسی اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھو، یہ بھی محبّت ہے۔ دیکھو، یہ شخص اپنی محبوبہ کے لئے کیسے تڑپ رہا ہے؟ مَیں تُم پر جان چھڑکتا ہوں، لیکن پھر بھی تُم ہر روز ہر نئے مرد پر پھسل جاتی ہو" شراب کے نشے میں لوگ ٹوٹی پھوٹی جرمنی، فرانسیسی اور انگریزی میں پکار رہے تھے ——— رَم، وِسکی، کاکٹیل، شمپین ———

مَیں نے مُنہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ یکایک تمام ہال بجلی کی روشنی سے دمکنے لگا تھا۔ ہال کی رونق دوبالا ہوئی

جارہی تھی۔ لوگ آرہے تھے، مسرّت و مستی اور کیف و سرور کی تلاش میں، اور جارہے تھے ہوش و حواس کھو کر۔ روشنی کی کرنیں بلّوریں اور نقرئی ساغروں پر مچل رہی تھیں۔ ہال میں تِل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ اِس لئے کتنے لوگ یونہی کھڑے ہی پی کر چلے جارہے تھے اور اب تو ہمارے میز پر بھی ایک جوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اُس کا اِس عمر میں شراب پینا اِس بات کا شاہد تھا کہ وہ بہت جذباتی ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد لڑکی بولی: "آپ میری موجودگی کو بُرا تو محسوس نہیں کر رہے ——؟" میرے جواب دینے سے پہلے ہی پاؔل لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بول پڑا تھا۔ "نہیں نہیں پیاری —— ہرگز نہیں۔"

کچھ دیر کے سکوت کے بعد مَیں اُٹھ کر بالکونی میں چلا آیا۔ اُونچے اُونچے ایوانوں کے دریچوں میں ہری، نیلی، پیلی روشنیاں مُسکرا رہی تھیں۔ مَیں وہاں کھڑا نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ جب مَیں واپس آیا تو پاؔل اور وہ لڑکی ایک دُوسرے کے سہارے بیٹھے تھے۔ لڑکی پاؔل کے کاندھے پر سر رکھے شاید سوچ رہی تھی۔ کاش! آج اِس اجنبی کی جگہ میرا محبُوب ہوتا۔ اب تو سرد ہو رہی ہے احساسات کی تپش۔ پھر سرد ہو جاتی ہے دل کی تپش۔ پاؔل کا ہاتھ لڑکی کی کمر کے گرد حمائل ہو گیا تھا اور وہ کہنے لگا تھا۔ "ہاں، تمہاری مانند بالکل ایسے ہی، ہیلن کی آنکھیں بھی شربتی ہیں اور جیسے تمہاری آنکھوں میں ڈورے ہیں، یہ عنابی سے ڈورے،

ایسے ہی ڈورے ایک رنگین شام ہیلین کی آنکھوں میں اُبھر آئے تھے میری آنکھوں میں تو دیکھو" پال نے اُس کی ٹھوڑی کو سہارا دے کر اُٹھایا۔ آرکیسٹرا سحر انگیز دُھن میں بج رہا تھا اور وہی بے ہنگم آوازے گونج رہے تھے ——— رَم، وِسکی، کاکٹیل، شمپئین ———!

پال لڑکھڑایا۔ مَیں نے اُسے سنبھالا اور ایک نظر اپنی رلیسٹ واچ پر ڈالی۔ ایک بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ فضا اب بھی خاموش تھی، کسی بھولی لڑکی کی مانند، جسے مستقبل کی ہل چل کا علم نہ ہو۔ پال رُکے رُکے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کوئی گیت گنگنا رہا تھا ——— مقدّس رات بیتی جا رہی ہے۔ یہ فرانسیسی آج یوم آزادی منا رہے ہیں۔ اپنے اُن بزرگوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں، جنہوں نے اپنے خون سے اپنے وطن کی سرزمین کو لالہ زار بنا کر اُس کے سر پر جمہوریت کا تاج رکھا۔

مَیں اور پال ——— ؟ ہم ایک غلام مُلک کے افراد ——— ہمیں قسمت لے آئی ہے اِن کے مذاق میں شریک ہونے کو۔

پہلی مرتبہ پال مجھے قاہرہ میں ایک رقاصہ کے یہاں لے گیا تھا۔ وہ ایک ماہرِ فن کی مانند آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کر رہا تھا اور مَیں شرمایا سا خاموش بیٹھا تھا، پھر پال طبلہ بجانے لگا تھا۔ رقاصہ کہہ رہی تھی "تم تو طبلہ بھی بجانا جانتے ہو" اور پال نے آنکھ دبا کر کہا تھا "مجھے بہت ہنر آتے ہیں" اُسی روز پال کے ایک مرتبہ "پیئو" کہنے پر مَیں اِنکار نہ کر سکا تھا

اور ہونٹ خود بخود گلاس سے لگ گئے تھے۔ پاَل کی آواز میں نہ جانے کیا جادُو ہے کہ اُس کی آواز سُن کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھنا ہی پڑتا ہے اور اُس کے چہرے سے جھلکتی ہُوئی جاذبیت ہر جوان لڑکی اور بُوڑھی عورت کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ ابھی جب ہوٹل میں پاَل اُس لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے نکلتے ہُوئے ٹُوٹے پھُوٹے الفاظ نے کِس طرح ساتھ کی میز پر بیٹھی ہُوئی لڑکی کو مجبُور کر دیا تھا کہ وہ مُڑ کر دیکھے اور پھر وہ پاَل کو بہُت دیر تک پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُس کے ساتھی مرد کو کہنا پڑا تھا "پیاری، اُدھر کیا دیکھ رہی ہو؟ مَیں تو یہاں ہُوں"۔ اور پھر جاتے جاتے اُس نے ہمدردی جتاتے ہُوئے اپنے ساتھی سے کہا تھا "یہ شخص بہُت پی گیا ہے۔ اِسے اپنی کار میں چھوڑ آئیں تو کیا ہرج ہے" شاید وہ سوچ رہی تھی کہ پاَل کو گِرتے پڑتے سنبھالتے ہُوئے اُسے اپنے سینے سے لگا لینے کا موقعہ مِل جائے گا، لیکن پاَل بگڑ گیا تھا "مَیں نہیں جاؤں گا" وہ پکار اُٹھا تھا اور وہ اپنے دِل میں ارمانوں کا جنازہ لئے چلی گئی تھی۔

مَیں اور پاَل اُن دِنوں اِنگلستان میں تھے۔ سردی سے کانپتی ہُوئی ایک شام تھی۔ پاَل اُس روز بھی بہُت پی گیا تھا۔ پاَل اور ہیلن جوا کھیل رہے تھے۔ دونوں ایک دُوسرے کے لئے بالکُل اجنبی تھے، لیکن یُوں محسُوس ہوتا تھا، جَیسے اِن کے درمیان کوئی پُرانی اور گہری واقفیت ہو۔ ہیلن کھیلتے

کھیلتے سب کچھ ہار گئی۔ آخری نوٹ ہیلین کے بٹوے سے نکلا اور اُس نے بھوؤں کو ایک عجب انداز سے حرکت دے کر کہا۔ "اب آؤ۔ دیکھوں اِس مرتبہ تم کیسے جیتتے ہو۔"

تیر پال کے سینے میں جا لگا اور وہ پکار اُٹھا تھا۔ "اِتنا بڑا داؤ ——! تم نے اِس اشارے میں وہ چال پھینک دی ہے، جسے میں نہیں جیت سکتا۔ لو یہ سب تمہارا ہے ——!" اور اُس نے اپنی جیب سے تمام سکّے نکال کر زبردستی ہیلین کے پرس میں ڈال دئے تھے اور پھر ہم تینوں بار میں چلے گئے تھے۔ نقرئی ساغروں میں سُرخ شراب رقصاں تھی۔ ہیلین کے سُرخ ہونٹ اور بھی سُرخ ہو گئے تھے۔

ہم لڑکھڑاتے ہُوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل چلے آئے تھے اور آج کی مانند جب ہم ٹیکسی میں بیٹھے تھے، تو ہیلین پال کی آغوش میں لیٹ گئی تھی۔ اُمڈتے ہُوئے جذبات نشے میں لڑکھڑا رہے تھے اور پھر جب ہم اپنے کمرے میں پہنچ گئے تھے ہیلین اور پال ایک دُوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ناچنے لگے تھے اور پھر دونوں لڑکھڑا کر صوفے پر گر گئے تھے۔ دو سازوں کے نغمے ہم آہنگ ہو گئے تھے —— دو دِلوں کی دھڑکنیں ایک دُوسرے میں سما گئی تھیں۔ جذبات کا سیلاب مجھے باہر بالکونی میں لے گیا تھا اور جب میں واپس آیا تھا تو ہیلین کی بانہیں پال کی گردن میں حمائل تھیں اور وہ دونوں بے حِس پڑے تھے۔

اور پھر پال کے تقاضے نے ہیلن کو کچھ دِن اُس دُکان پر نہیں جانے دیا تھا، جس پر وہ کام کرتی تھی۔ وہ سچ مچ ایک دُوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھوئے ہُوئے، ہم نے کچھ دِن کاٹے تھے، لیکن ہمیں پھر فرانس آنا پڑا تھا۔ میں آنسوؤں کے وہ قطرے تمام عُمر نہیں بھُول سکتا، جو ہیلن کی آنکھوں سے ہمارے واپس آنے کے وقت بہہ نکلے تھے۔ جنہوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبُور کر دیا تھا کہ کیا ایک ایسی عورت جس کی زندگی میں نہ جانے کتنے مرد آ چکے ہوں، یُوں محبت کر سکتی ہے؟

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اِس کے ایک سال بعد مجھے پھر انگلستان جانے کا موقعہ ملا اور پال کی خواہش پر میں ہیلن سے ملنے بھی گیا تھا۔ مجھے ہیلن ملی، لیکن دِق کے جبڑوں میں۔ جہاں اُسے پال کی جُدائی کا غم اور کثرتِ شراب نوشی لے گئی تھی۔ اُس چہرے پر جو کبھی نوخیز کلی کی مانند مُسکراتا تھا، اُداسی بکھری ہوئی تھی۔ اُس کے زرد چہرے اور دھنسی ہُوئی آنکھوں کو دیکھ کر میری رُوح کانپ اُٹھی تھی۔ بہت دیر تک ہم دونوں پال کی باتیں کرتے رہے اور جب میں واپس آنے کو تھا، تو ہیلن نے میرا دامن تھام کر مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ میں پال سے کہہ دُوں کہ میں اُسے نہیں ڈھُونڈ سکا ——— اور آج تک یہ راز میرے سینے میں دبا پڑا ہے ——— پال سے میں نے جھُوٹ کہہ دیا تھا۔ پال کے دِل میں اب بھی اُمید کی شمع روشن ہے۔ وہ سوچتا ہے

مَیں مہلن کو ڈھونڈ لوں گا۔

آج مجھے رینو کی یاد آ رہی ہے۔ وہ پنگھٹ کے پاس والے کچّے مکان میں رہا کرتی تھی۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے مَیں نے لوگوں کو یہی کہتے سُنا ہے، وہ بیوہ ہے، لیکن اُس کی بیوگی میری محبّت کی ندی کی روانی کو نہ روک سکی تھی۔ ایک کنواری لڑکی اور بیوہ؟ آج تک سماج کا یہ ضابطہ میری سمجھ میں نہیں آیا اور آج جبکہ مَیں ایک آزاد مُلک میں ہوں، مجھے احساس ہو رہا ہے کہ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ یہاں کوئی بیوہ نہیں ہے، کوئی بوڑھا نہیں ہے اور نہ کوئی جوان نہیں ہے۔ ہر ایک کے جذبات کا یکساں احترام ہونا چاہیئے۔

مجھے اپنے کھیتوں کو جاتے ہُوئے رینو کے گھر کے پاس سے گُزرنا پڑتا تھا۔ رینو مجھے دیکھ کر اپنا مُنہ گھونگھٹ میں چھپا لیا کرتی تھی، لیکن میرا احساس میری نظروں کو گھونگھٹ کی اوٹ میں بھی لے جاتا۔ میری محبّت حیا بن جاتی اور رینو کی پلکیں اِس بوجھ سے دب جاتی تھیں۔

ایک دِن مَیں نے رینو سے پُوچھ ہی لیا تھا۔ ”رینو! تم سے ایک بات پُوچھوں ——؟“ اور حیا سے اُس کی پلکیں جُھک گئی تھیں۔ رخسار تمتما گئے تھے، شاید اُس نے میرے دِل کی دھڑکنوں میں لپٹا ہُوا اپنی محبّت کا راگ سُن لیا تھا۔ مَیں نے اُسے اپنی انگوٹھی پہنا دی تھی۔ اُس کی ٹھوڑی کو اُٹھایا۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں اور دو جوان دِلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ

ہو گئیں۔

اُسی رات میں پنگھٹ پر جا بیٹھا تھا۔ میری بنسری سے نغمے پھُوٹ رہے تھے۔ آسمان میں چاند یُوں مُسکرا رہا تھا، جیسے کسی سُہاگن کے ماتھے کا ٹیکا۔ رینو پانی بھرنے کے بہانے پنگھٹ پر چلی آئی تھی۔ اُس رات ہم ایک دُوسرے میں سما گئے تھے اور دبی دبی ہنسی اور سرگوشیاں یُوں بکھر رہی تھیں، جیسے سنگریزوں پر سے گذرتے ہُوئے پانی کا ترنّم۔

اور پھر مَیں اور رینو ایک دن پنگھٹ کے پاس ایک دُوسرے سے باتیں کرتے ہُوئے دیکھ لئے گئے تھے۔ چند اُجڈ دیہاتیوں کے بنائے ہُوئے ضابطوں سے گھبرا کر مَیں اِتنی دُور چلا آیا ہُوں۔ میری محبّت؟ —— مَیں راہِ اُلفت پر قدم جما نہیں سکا —— اور پاآل —— اُس کی محبّت غیر فانی ہے۔ پہاڑ کی طرح مستحکم۔ ایک طرف اُس کی محبُوبہ اِس فرض کو نبھا چکی ہے۔ ایک دِن پاآل بھی اِس فرض کو نبھائے گا —— یہ سوچتے سوچتے میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی "نہیں، پاآل کو مَیں نہیں چھوڑ سکتا۔" مَیں نے پاآل کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ بولا۔ اب وہ قدرے ہوش میں تھا۔

"کچھ نہیں!" اِس سے زیادہ مَیں نہ بول سکا۔ ہم پھر دھیرے دھیرے چل دِئے۔

مَیں سوچنے لگا —— کتنا فرق ہے میری اور پاآل کی محبّت میں؟

پاکی کو نئی تہذیب کے کیچڑ میں بھی کنول مل گیا اور مجھے سچّی محبّت کا ایک اچھوتا کنول ملا، لیکن میں اُسے اپنے پاس نہ رکھ سکا۔ میں نے اپنے آرزوؤں کے نخل کو کچلے جاتے دیکھا، لیکن میرے لب نہ ہل سکے۔

میری نظریں سامنے اُٹھیں تو بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا "ہوٹل ڈی پیلیس"۔ نہ جانے نشے میں ہم کب واپس ہوئے تھے ہم دونوں اندر چلے آئے۔ ہوٹل کے وسیع ہال میں آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ شراب کے نشے میں لوگ ناچ رہے تھے —— اور وہی بے ہنگم آوازے گونج رہے تھے۔ رَم —— وِسکی —— کاکٹیل —— شمپئین —— !

آگ

برف تیزی سے گر رہی تھی۔ رم کی آدھی بوتل ختم کرنے کے بعد ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے اور سڑک کے ساتھ لگے ہوئے جنگلے کو پکڑ پکڑ کر چلتے ہوئے ریچ تک پہنچ گئے۔ ریسٹورنٹ میں بجتے ہوئے ناچ کی دُھن کے ریکارڈ کی آواز ابھی تک سُنائی دے رہی تھی۔ جوزف نے سیٹی بجائی اور اکیلے جاتی ہوئی اینگلو انڈین لڑکی کو پُکارا ——

"ہیلو سویٹی ——"

"ہیلو ——" اُس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا اور ٹھہر گئی۔

"تمہیں جانتی ہے ——؟" میں نے پُوچھا۔

"ہوں ——" اُس نے جواب دیا اور بڑھ کر اُسے باہوں

میں کس لیا۔ میری نگاہیں سامنے لگے ہوئے پوسٹر پر جم کر رہ گئیں۔ بیٹی ڈیوس ایک آنکھ بند کئے مسکرا رہی تھی۔

گرجے کی بوڑھی گھڑی برف کی قبا میں لپٹی ہوئی تھی۔ کئی امیر لوگ لمبے لمبے کوٹ پہنے ہوئے گردنوں میں مفلر لپیٹے اور شاید وسکی کے دو دو پیگ بھی پیئے ہوئے برف کے گرنے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور سامنے چرچ روڈ کی چڑھائی پر چار کشمیری مزدور کسی مشین کا ایک وزنی پرزہ اٹھائے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پاؤں پھسلنے کے ڈر سے وہ گھاس کی پولیں پہنے ہوئے تھے اور خنکی سے منجمد نیلی ایڑیوں سے پھٹی ہوئی بوائیوں سے سرخ سرخ، سیاہ خون بہہ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا یہ ہاتھ لوہا اور پتھر اٹھاتے اٹھاتے لوہا اور پتھر ہی تو بن گئے ہیں۔ لیکن ایک مضبوط مشین کے گھسے ہوئے، ٹوٹے ہوئے، ناکارہ پرزے! میرے قریب سے ایک ٹومی سیٹی بجاتا ہوا گزرا۔ جوزف نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں ——— پھر اکیلے ہی؟"

"ہوں۔" اس نے بے پروائی سے فیلٹ پر جمی ہوئی برف جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے کوٹ کی جیب میں رکھی ہوئی بوتل سیدھی کی۔ ہم پارک کے پاس سے گزرتی ہوئی سڑک پر چلنے لگے۔ برف ترچھی گرنے لگی تھی۔ میں نے فیلٹ کو سامنے جھکا لیا اور سوچنے لگا ——— آج یہ

آخری دن ہے اور آج رات ہم ایک اَن جانی جگہ کے لئے روانہ کر دئیے جائیں گے۔ پھر ذہن سے ہر آرزو مِٹ جائے گی۔ صرف آہنی گولیاں، پگھلا ہُوا سیسہ ـــــ اور متعفّن لاشیں۔ کون جانے پھر ہم لوٹ کر بھی آسکیں گے یا نہیں؟ اور آج بھی یہ خاموشی، آج بھی یہ دِل بُجھا ہوا!

"جوزف، یہ کون تھی ـــــ؟" مَیں نے سکوت کو توڑا۔

"یہ فلورنڈا ـــــ؟"

"ہاں، ہاں! یہی، جسے ابھی سینے سے لپٹا رہے تھے۔ کیسے جانتی ہے تمہیں ـــــ؟"

"کیسے جانتی ہے ـــــ؟"

اُس کی بات ادھوری ہی تھی کہ ایک کرنل تیزی سے قدم اُٹھاتا ہُوا ہمارے قریب سے گزرا۔ ہم نے فوجی سلام کیا اور وہ جواب دے کر مُسکراتا ہُوا گزر گیا۔ مَیں نے پھر جوزف کو اپنی طرف متوجّہ کیا۔ لیکن اُس نے میری طرف توجّہ کئے بغیر ہی ایک سرسری سی نگاہ اِدھر اُدھر دَوڑا کر میری جیب سے بوتل نکال کر مُنہ سے لگالی۔ تین چار گھونٹ پی کر اُس نے ہونٹوں پر جمتی ہُوئی تلخی زبان پھیر کر مٹائی اور بوتل کا کارک بند کر کے میری جیب میں ڈال دی ہم پھر دھیرے دھیرے چل دئیے۔ ایک کشمیری مزدور جو نا کافی کپڑوں میں سُکڑا ہُوا تھا اور جس نے ہاتھ گرم رکھنے کے لئے بغلوں میں داب رکھے تھے، ہمیں گھورتا ہُوا قریب سے گزرا۔ میرے جی میں نہ جانے کیا آئی۔

مَیں نے اُسے پکارا۔

"اے ہاتو——"

"ہاں ساب——" کہتا ہُوا وہ میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"ہاتو، تُم کو سردی نہیں لگتا؟" مَیں نے پُوچھا۔

"لگتا ہے ساب، لیکن کیا کرے گا جی ساب، بوجھ ہونے سے اُٹھائے گا——!"

"شراب کے بغیر اتنی سردی میں مرتا نہیں ہے؟" مَیں بے ڈھب سوال کئے جا رہا تھا۔

"گریب آدمی ہے ہجُور——" مَیں نے دِل میں سوچا یہ بات تو بالکُل ٹھیک ہے۔ غریب کو موت مُشکل سے آتی ہے۔

"اچھا ہاتو پیئے گا تُم——؟"

"مِلنے سے پیئے گا ساب"۔ اور مَیں نے کارک کھول کر بوتل اُس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ دو ہی سانسوں میں ختم ہو جانے کے بعد اُس کے چہرے پر پھیلی ہُوئی مُردنی کی جگہ ایک ہلکی سی مُسکراہٹ نے لے لی۔ کچھ دیر قریب سے گُزرتی ہُوئی ہندوستانی لڑکی کو گھُورنے کے بعد جب مَیں اُس کی طرف متوجّہ ہوا۔ تو وہ میرے بُوٹوں پر سر رکھ کر خود کو گالیاں دینے لگا۔ "ہم حرام کا بچّہ ہے ساب، ہم نے شراب پیا ہے۔ آپ کا کوئی قصُور نہیں ہم کو جُوتا مارو۔" جوزف نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور ہم آگے

بڑھ گئے۔

سڑک کی نچلی طرف ایک میم برف کا ڈمی بنا کر اُس کے مُنہ میں پائپ ٹھونس رہی تھی۔ اُس کی سپید سپید ننگی پنڈلیاں سردی سے سُرخ ہو رہی تھیں میں سوچنے لگا غریبوں کا لہو سردی سے نیلا کیوں پڑ جاتا ہے؟ —— امیروں کے لہو کی سُرخی سردی سے گہری کیوں ہو جاتی ہے؟ سوچتے سوچتے میرے دِل میں ایک حیوانی جذبے نے انگڑائی لی، اور میری نگاہیں سُرخ سُرخ پنڈلیوں پر پھسلنے لگیں۔ جوزف نے جو شاید خاموشی سے اُکتا گیا تھا، ٹوکا——

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، سوچ رہا تھا، اِس عورت کی گوری گوری پنڈلیاں کتنی جاذبِ نظر ہیں؟ میرا جی چاہتا ہے، میری اُنگلیاں اِس عورت کے مرمریں پیکر پر پھسلنے لگیں!"

"رُومان نویس ہو نا!" وہ مُسکراتے ہُوئے بولا۔

"جوزف، کل ہم فرنٹ پر ہوں گے۔ یہ زندگی کے آخری لمحات، آخری ہی تو ہیں، اگر ہم لَوٹ نہ سکے! اور آج بھی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہی پھیکاپن ہے، جس سے دِل اُکتا چُکا ہے۔ لیکن کیوں، کیا ہم اِنسان نہیں ہیں؟"

"اِس لئے کہ ہم غریب ہیں۔ معمُولی سے سپاہی، جن کی موت اپنے افسروں کو تو بڑے بڑے اعزاز دلوا سکتی ہے۔ لیکن اُن کی بیوہ عورتوں کو اد

یتیم بچوں کو صرف آٹھ روپے ماہوار کی پنشن! اور آج جبکہ ہم اپنی پونجی لٹانے کے لئے بھی تیار ہیں، فلورنڈا جیسی لڑکیاں ہمارے سٹیشنوں پر بڑے بڑے اعزاز ڈھونڈتی ہیں۔"

ہم پھر خاموشی سے چلنے لگے۔ برف دھیمی دھیمی گرنے لگی تھی ہم سڑک کے کنارے ایک شیڈ میں بیٹھ گئے۔ شکار کی تلاش میں گھر سے نکلی ہوئی کمسن لڑکی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں سے کسی نے سُرخی چوس لی تھی۔ اُس کی آنکھیں کسی قحط زدہ بھوکے کی مانند بجھی بجھی تھیں۔ مَیں نے مسکرا کر آنکھ دبا دی اور سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچ لیا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"سگریٹ ہو گی آپ کے پاس؟"

"بہت" مَیں نے ڈبیا اُس کے ہاتھوں میں تھما کر اُس کی کمر سے بازو لپٹا لیا۔ وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور میری خواہش کے بغیر ہی اپنے پھیکے پھیکے باسی ہونٹ سامنے کر دیئے۔ مجھے گھن سی آئی اور مَیں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اُٹھو جوزف، چلو چلیں۔" مَیں نے اُس کا بازو پکڑ کر اُٹھایا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم مال روڈ کی طرف مُڑ گئے۔ ہم پھر خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جوزف میرا بازو تھامتے ہوئے بولا "تم نے پُوچھا تھا، فلورنڈا کو کیسے جانتا ہوں؟"

"ہاں پوچھا تو تھا۔ کیوں بتاؤ گے؟" میں نے کہا اور جواب میں اُس نے کہنا شروع کیا۔

"آہ! فلورنڈا، انسان کتنا بدل جاتا ہے کبھی یہی فلورنڈا گلے میں باہیں ڈال کر وعدے لیا کرتی تھی اور میرے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی تھی اور آج ———— آج جبکہ مجھے اُس کی ضرورت ہے تو اُس کے پاس مجھ سے بات کرنے کو وقت بھی نہیں ہے ————" اُس نے ایک آہ بھری اور ایک بے بسی کی مسکراہٹ کے بعد کہنے لگا۔

"اُن دنوں میں شملہ کے ایک دفتر میں کلرک تھا۔ دن کو لنچ ٹائم میں کافی ہاؤس جانا میرا شغل سا ہو گیا تھا۔ میں ایک لڑکی کو روز دیکھتا۔ وہ اکثر میرے سامنے والے ٹیبل پر بیٹھا کرتی معصوم، بھولی بھالی سی لڑکی۔ اگر میں کبھی اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا اور اتفاقاً میری نگاہیں اُس کی نگاہوں سے ملتیں تو وہ شرما جاتی۔ اُس کا مُنہ کانوں تک سُرخ ہو جاتا۔ اُس کی جھکی جھکی پلکیں دل کی بات کہہ دیتی تھیں۔ ایک دن اُسے آنے میں کچھ دیر ہو گئی اور جب وہ آئی تو کافی ہاؤس لنچ ٹائم میں آئے ہوئے کلرکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صرف میرے ٹیبل پر ایک کرسی خالی تھی۔ اُف! کتنا حسین اتفاق تھا! اُس کے بشرے پر پریشانی کے تاثرات تھے لیکن جب اُس نے مجھے دیکھا تھا تو اُس کے چہرے کی رنگت پھر بدل گئی تھی۔ وہی حیا کی سُرخی کانوں تک پھیل گئی تھی۔ اُس نے پھر اِدھر اُدھر کرسی ڈھونڈھی لیکن

کوئی جگہ خالی نہ پاکر آخر اُسے میرے ٹیبل پہ آنا ہی پڑا تھا۔ کتنا سوز تھا اُن الفاظ میں۔ "آپ بُرا نہ مانیں تو میں بیٹھ جاؤں؟" مجھے اُس کی ایک ایک حرکت یاد ہے، ایک ایک بات یاد ہے۔ جب وہ کافی پی رہی تھی، تو میں نے اُس سے پُوچھا تھا۔ "آپ مُلازم ہیں کہیں؟" وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔ "جی ہاں ——" نہ جانے وہ کیوں اچھی طرح بات کرنے سے قاصر تھی۔ "کہاں؟" میں نے پھر پُوچھا تھا اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی تھی۔ ہمارے ٹیبل پہ بیٹھا ہُوا جوان جوڑا ہماری باتیں سُن کر مُسکرانے لگا تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ باہر اُٹھ آئے تھے اور جب میں نے کاؤنٹر پہ اُس کا بِل بھی ادا کر دیا تھا، تو اُس کے مُنہ سے تکلّف کا ایک لفظ بھی نہ نِکل سکا تھا۔ میں اُس کے بھولے پن پر مِٹتا جا رہا تھا۔ "مجھے اِدھر جانا ہے۔" وہ سکینڈل پوئنٹ تک میرے ساتھ جانے کے بعد بولی تھی۔ "میں پوسٹ آفس میں مُلازم ہُوں۔"

"اچھّا دِن مُبارک، لیکن آپ کا نام؟" میں نے پُوچھا تھا۔ "فلورنڈا۔" اُس نے کہا اور شرمائی سی ایک دم پوسٹ آفس کی طرف مُڑ گئی تھی۔ میں وہیں کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کچھ دُور جانے کے بعد مُڑ کر دیکھا تھا، لیکن مجھے وہیں کھڑا پاکر وہ ایک دم پھر پلٹ گئی تھی۔ یہ تھی فلورنڈا سے میری پہلی مُلاقات۔"

ہوا تیزی سے چلنے لگی تھی اور برف کی رفتار پھر تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہم نے آمنے سامنے کھڑے ہو کر سگریٹ سُلگائے اور پھر چلنے لگے۔ جوزف پھر

کہنے لگا تھا

"اُس کے دُوسرے دِن مجھے فلورنڈا پھر ملی۔ ہم نے ایک ہی ٹیبل پر کافی پی۔ کچھ یُونہی بے معنی سی باتوں کے بعد فلورنڈا بولی تھی" آج شام بال میں آؤ گے؟" اور میں سوچ رہا تھا کہ کون سی بات ہے جو فلورنڈا کہے اور میں نہ کرُوں۔ "ہاں ہاں ضرور آؤں گا۔" میں نے جواب دیا تھا اور اُس رات بال رُوم میں جب فلورنڈا میرے ساتھ رقص کر رہی تھی تو دُنیا مُسکرا رہی تھی، بجلی کے قمقمے مُسکرا رہے تھے، نیم باز آنکھیں مُسکرا رہی تھیں۔ رقص کا گاؤن پہنے فلورنڈا ایک اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ سب تو رقص کی دُھن پہ ناچ رہے تھے اور ہم جذبات کے نشے میں چُور ایک دُوسرے کے دِل کی دھڑکنیں سُن رہے تھے۔ میرے اصرار پہ فلورنڈا نے بھی پی لی تھی اور جب میں اُسے چھوڑنے اُس کے گھر تک گیا تھا، تو بجلی کے کھمبے تلے کھڑے ہو کر میں نے اُسے الوداعی بوسہ دیا تھا اور اُس کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے ڈورے مُسکرانے لگے تھے۔

ہم روزانہ کافی ہاؤس میں ملتے۔ شام کو مال روڈ پر سیر کرتے اور یُوں کئی حسین یادیں ہماری زندگیوں سے وابستہ ہوتی گئیں۔ وہ دِن میری زندگی میں ہمیشہ ایک حسین ترین یاد بن کر رہے گا، جس روز ہم پکنک کے لئے "وائلڈ فلاور پارک" گئے تھے۔ جنگلی پھُول ہوا کے مستی بار جھونکوں سے جھُوم رہے تھے ۔ میں اور فلورنڈا پیڑوں کے ایک جھُنڈ تلے لیٹ گئے

تھے۔ سامنے اُونچے نیچے ٹیلوں پر گاؤں کی الھڑ لڑکیاں ڈھور چرا رہی تھیں۔ اُن کے گیتوں میں ایسا سوز تھا کہ مَیں اُنہیں پُوری طرح سمجھے بغیر بھی اُن سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے یُوں محسُوس ہو رہا تھا کہ اِن جوان لڑکیوں کے گیت بھی اِس فضا کا ایک عنصر ہیں۔ جب ہوا کے ایک تیز جھونکے سے چیڑ کے درختوں کی لچکیلی ڈالیاں جھُومنے لگتیں تو ایک عجیب سا نغمہ فضا میں بیدار ہو جاتا۔ فلورنڈا کے بال ہوا کے جھونکوں سے بکھر رہے تھے اور موٹی موٹی آنکھیں خاموش ہوتے ہُوئے بھی کچھ کہہ رہی تھیں اور مَیں سُن رہا تھا اُن نرگسی آنکھوں کے گیت، اور کھو رہا تھا اُن رسیلے ہونٹوں کی لطافتوں میں۔

وہ دِن ——— وہ دِن میری زندگی میں حسین ترین دن تھا۔"

چرچ روڈ کی طرف مُڑتے ہُوئے ہم نے ایک فوجی افسر کو سلام کیا اور جب وہ افسر پارک روڈ کی طرف مُڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو جوزف خود کو گالیاں دینے لگا تھا۔

"کاش! مَیں فوج میں بھرتی نہ ہوتا،" اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"جنگ شرُوع ہو چکی تھی اور اِدھر مجھ پر قرضے چڑھتے جا رہے تھے۔ مَیں فلورنڈا کی ہر خواہش کو ہنس کر پُوری کرتا رہا لیکن آخر ایک دِن تنگ آ کر مَیں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میرے تصوّر میں حسین مُستقبل مُسکرا رہا تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا شاید جب مَیں واپس آؤں تو میرے کندھوں پر بھی بڑے بڑے اعزازی تمغے ٹنگے ہُوئے ہوں۔ لیکن مَیں ویسے ہی لوٹ آیا ہوں۔

ایک معمولی سا سپاہی۔ مَیں نے کئی بار اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں بھی ڈال کر دیکھا اور اب تو میری سمجھ ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک معمولی سپاہی کیونکر ترقی کر سکتا ہے؟ کیسے؟ کیونکر ———؟

میں نے جب فلورنڈا سے اپنے جانے کا ذکر کیا تھا، تو وہ بے اختیار میرے سینے سے لپٹ کر رونے لگی تھی اور مَیں پچھتا رہا تھا کہ مَیں نے کیوں یہ حماقت کی ہے؟ مَیں نے اُسے دلاسا دیا تھا کہ مَیں جلد ہی لَوٹ آؤں گا اور جب مَیں لَوٹ کر آؤں گا تو ایک بہت بڑا افسر ہوں گا اور پھر مَیں تم سے شادی کر لوں گا اور پھر ہم ایک بڑے سے بنگلے میں رہنے لگیں گے۔ وہ مُسکرا دی تھی۔

مَیں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ مَیں جا رہا ہوں۔ مجھے الوداع کہنے صرف فلورنڈا آئی تھی۔ ہم پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور مَیں اُسے دلاسا دے رہا تھا کہ مَیں ضرور لَوٹوں گا اور جب گاڑی نے وِسل دی تھی تو مَیں فلورنڈا کو لئے ہوئے اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا تھا اور جب گاڑی پلیٹ فارم سے دِھیرے دِھیرے رینگنے لگی تھی تو فلورنڈا نے رُومال ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ "مَیں تمہارا انتظار کروں گی"۔

لیکن آج ——— آج یہاں کی ہر چیز مجھے اجنبی سمجھتی ہے۔ فلورنڈا کے پاس بھی میرے لئے وقت نہیں ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ ہم رینج پر پہنچ چکے تھے۔ مَیں پارک میں بیٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ جوزف بولا:۔

"ابھی تو سات بجے ہیں۔ گاڑی تو دس بجے جائے گی۔ آؤ بار میں بیٹھیں"

ہم ریج سے مڑ کر رنگل کی بڑی عمارت کی بے شمار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد جب بار میں پہنچے تو فلورنڈا نشے میں چور بار روم سے باہر آ رہی تھی اُس کی کمر کے گرد بازو حمائل کئے ہوئے ہماری بریگیڈ کا ایک میجر کہہ رہا تھا۔

"جان سے عزیز فلورنڈا، میں آج رات فرنٹ پر جا رہا ہوں لیکن...."

وہ اُس کے چہرے پر جُھک گیا اور بولا "میں لوٹ کر ضرور آؤں گا تمہارے لئے"

فلورنڈا نے ایک ہچکی لی اور بولی "ڈیر! میں تمہارا انتظار کروں گی"

جوزف کھڑے کھڑے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ میں صوفے میں دھنس گیا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میرے چاروں طرف آگ جل رہی ہو ـــ جذبات کی آگ، آہوں کی آگ، ہچکیوں کی آگ، بے بسی کی آگ، مجبوریوں کی آگ!

ڈوبتی نبضیں

افراد :-

جیون —— ایک پچیس سالہ نوجوان - جو ایک طویل مدت سے بیمار ہے جسے اندھیرے اور روشنی سے ڈر آتا ہے - جسے جلدی جلدی دَورے پڑتے ہیں اور جو بے ہوشی میں بڑبڑانے لگتا ہے۔

سُدھا —— جیون کی بیوی - ایک بیس سالہ عورت - جس کی آنکھوں سے اُمنگوں کا خُمار ابھی ڈھلا نہیں - جسے اپنے بیمار شوہر سے نفرت ہے - لیکن جو نفرت کو اپنے دل میں دبائے ہُوئے ہے۔

آشا —— جیون اور سُدھا کی پانچ سالہ بیٹی۔

ڈاکٹر ——— ایک ڈاکٹر ہے۔

(ایک وسیع کمرہ ہے حسین فرنیچر۔ کمرے میں ایک کونے میں ٹیلی فون پڑا ہے۔ جا بجا تصویریں آویزاں ہیں۔ کمرے کے وسط میں سُدھا کا بیمار شوہر جیون، بستر میں بیہوش پڑا ہے۔ بیمار کے پلنگ کے پاس ہی صوفہ پڑا ہے۔ سامنے کھڑکی ہے، جس پر پردے گرے ہوئے ہیں اور کھڑکی سے باہر باغ ہے، جس میں یوکلپٹس کے اُونچے اُونچے پیڑ ہیں اور اُن سے اُوپر آسمان میں چاند مسکرا رہا ہے۔ مریض کے کمرے سے مُلحق دو کمرے ہیں، جن کے دروازے مریض کے کمرے میں کھلتے ہیں۔ ایک کمرے میں جیون کی بیٹی آشا سو رہی ہے اور دُوسرے کمرے میں جیون کی بیوی سُدھا کی صوفے میں بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی ہے ———

جیون کے کمرے میں ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔

ہر چیز ——— میز، کرسیاں، صوفہ، دیواروں پر سائے گرا رہی ہے، جس سے دیواروں پر مختلف شکلیں بن گئی ہیں، جن سے مریض کو خوف محسوس ہوتا ہے۔ بیہوشی ٹوٹتی ہے۔ جیون آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتا ہے اور اپنے گرد پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر اور اپنے دُکھ کا احساس

کر کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کراہنے لگتا ہے)

جیون —— آہ ! —— آہ ! میری رُوح کے گرد محیط ہوئے جاتے ہیں، اندھیرے ! —— دبیز اندھیرے !! ——
کائنات ڈُوب رہی ہے تاریکیوں میں —— آہ !
تاریکیاں ہی تاریکیاں !!
اُف ! —— آہ ! —— آہ !! —— میرا گلا گھونٹ رہی ہیں یہ تاریکیاں —— ہائے —— !!!
(چیختا ہے) سُدھا ! —— سُدھا !!

(سُدھا کمرے میں داخل ہوتی ہے)

سُدھا —— ناتھ !

جیون —— سُدھا ! —— دریچوں سے پردے ہٹا دو ——
چاندنی کو کمرے میں جھانکنے دو —— دیکھو ! میرے گرد کتنا اندھیرا ہے !! —— میری رُوح ڈُوب رہی ہے اِن تاریکیوں میں —— تاریکیاں ! —— میری آنکھوں کے پپوٹے جل رہے ہیں —— میری آنکھیں جل رہی ہیں —— پردے ہٹا دو !

{ دریچوں سے پردے ہٹا کر سُدھا اُس کے سرہانے آ کر بیٹھ جاتی ہے }

جیون ——— میرے گرد آگ جل رہی ہے ——— وہ دیکھو یوکلپٹس کے پیڑ جل رہے ہیں ——— چاندنی نے آگ لگا دی ہے ——— نوچ ڈالو چاند کے چہرے سے اِس مُسکراہٹ کو ——— (کراہتا ہے)

(سُدھا، پانی کی چند بوندیں اُس کے حلق میں ٹپکا کر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے ——— جیون بیہوشی میں بڑبڑانے لگتا ہے)

جیون ——— آہ! ——— آہ!! ——— آگ کے شعلے لپک رہے ہیں۔ آج تمام دُنیا آگ میں جل رہی ہے ——— مَیں جلنے لگا ہُوں ——— سُدھا! تمہاری مانگ کا سیندور جلنے لگا ہے ——— مجھے برف کی سِلوں تلے دبا دو ———

(رُک رُک کر بڑبڑاتا ہے)

برف کی سِلوں کے انباروں تلے
یوکلپٹس کے اُونچے اُونچے پیڑ جل رہے ہیں!
صدیوں سے یہ پیڑ یُونہی جلتے رہے ہیں!
صدیوں سے مَیں پناہ ڈھونڈتا رہا ہُوں!
میری رُوح آوارہ پھرتی رہی ہے!
پناہ!!

مجھے پناہ نہیں مل سکی !
تپش ! ——— جلن !!
خنکیاں ! ——— سکون !!
زندگی گزری ہے ——— کہاں کہاں سے !
کتنی بار تاریکیوں میں ڈوب ڈوب کر اُبھری ہے !
کتنی بار مسرّت ، ماتم میں ڈوب کر اُبھری ہے !
ماتم کے دھوئیں سے تاریکیاں اور بھی دبیز ہو گئی ہیں —
آہ ——— آہ ——— آہ ——— !!!

(کراہتے ہوئے بیہوشی ٹوٹ جاتی ہے - وہ اپنے ماتھے پر رکھے ہوئے سُدھا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے)

جیون ——— سُدھا ! کیا سوچ رہی ہو ؟

سُدھا ——— جی ! کچھ نہیں ——— آپ آرام کیجیئے ، ڈاکٹر نے بولنے کو بالکل منع کیا ہے -

(سُدھا خاموش ہو جاتی ہے - جیون ، سُدھا کے چہرے پر پھیلتی ہوئی پریشانی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے - اُس کی نگاہیں دریچے سے باہر اندھیرے پر جم جاتی ہیں)

جیون ——— سُدھا ! جب سے یہ دُنیا ہے جبھی سے مانگوں کا سیندور پٹتا آیا ہے اور چوڑیاں ٹوٹتی رہی ہیں اور یہ سدا ہوتا رہے گا -

لیکن جیسے پھٹے ہوئے کپڑے کی جگہ نیا کپڑا لے لیتا ہے۔
ایسے ہی مِٹے ہوئے سیندور کی جگہ ایک نئی لکیر کھینچی جا سکتی
ہے ــــــ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی جگہ نئی چوڑیاں پہنی جا
سکتی ہیں ــــــ تم بھی ایک نیا ساتھی ڈھونڈ لینا ــــــ
ایک نئی زندگی کا آغاز کر لینا ــــــ ایک نئی مسکراہٹ
کے ساتھ!

سُدھا ــــــ ناتھ! ــــــ ناتھ!! ــــــ ایسا نہ کہیئے ــــــ
ایسا نہ کہیئے۔
(سُدھا سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ جیون کچھ دیر کراہنے
کے بعد پھر بیہوش ہو جاتا ہے)

جیون ــــــ (بیہوشی میں پکارتا ہے) سُدھا!

سُدھا ــــــ (سِسکتے ہوئے جواب دیتی ہے) ناتھ!

(وقفہ)

جیون ــــــ ستاروں کے جھرمٹ
جھیل کا کنارا
پھولی ہوئی شفق
بیخودی میں جھومتے ہوئے کنول
ہم آہنگ ہوتی ہوئی دھڑکنیں

گیت ہی گیت
نغمے ہی نغمے
دھیمے سُروں میں گاتی ہوئی چاندنی
ستاروں کے جھُرمٹ

(وقفہ)

اندھیری راتیں
اندھیرا، دبیز اندھیرا
خامشی ہی خامشی
یاس و الم کے بادل
نوحے ہی نوحے
ماتم میں ڈوبی ہوئی کائنات
بے آہنگ دھڑکنیں
اندھیرا، دبیز اندھیرا

(وقفہ)

وقت کی راکھ تلے دب کر
دَم توڑا ہے کتنی چنگاریوں نے
مَیں بھی گزر جانا چاہتا ہُوں
زندگی کی گذرگاہ سے

میری رُوح اُکتا گئی ہے
اِن اندھیروں، اُجالوں سے
(وقفہ)
گیت، مُسکراہٹیں
کِتنے حسین ہیں یہ فریب
کِتنی خوفناک ہیں غم کی پرچھائیاں
اُداسیاں، نوحے
مَیں نے ڈھُونڈے تھے اِن میں
آشاؤں کے اُجالے
(وقفہ)
کِتنے ہی قافلے گُذر گئے
اَرمانوں کے بوجھ سے گردنیں جُھکائے ہُوئے
کِتنے ہی اَرمان دِلوں ہیں رہ گئے
ناکامیوں کی لُو سے جُھلسے ہُوئے
زندگی ایک مختصر سا سفر ہے، لیکن
مُشکلات کے پہاڑ گردنیں اُٹھائے ہُوئے کھڑے ہیں
(وقفہ)
میری طرف بڑھ رہے ہیں

ناکامیوں کے سیاہ بھوت
سیاہ مُسکراہٹوں سے میرا مذاق اُڑاتے ہوئے
سیاہ ہاتھوں میں تلخیوں کے سیاہ پھول لئے
سیہ دلی سے سیاہ تحفے لئے ہوئے

(وقفہ)

مَیں گزر جانا چاہتا ہُوں
زندگی کی گزرگاہ سے
اُمیدوں کے چراغ بُجھائے ہوئے
حسرتوں کے ناسُور چھُپائے ہوئے

(بیہوشی ٹوٹ جاتی ہے۔ جیون آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتا ہے۔ سُدھا کے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھتے ہوئے، ہونٹوں پہ مُسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہُوئے پُوچھتا ہے)

جیون ——— سُدھا! آشا کہاں ہے؟

سُدھا ——— ساتھ والے کمرے میں سو رہی ہے۔

جیون ——— کتنی پیاری ہے میری بچّی! سُدھا، اُس کی آنکھیں بالکل تُم سے ملتی ہیں۔

سُدھا ——— اور بال آپ کے بالوں کی طرح گھُنگھریالے ہیں ——— کتنے پیارے ہیں اُس کے سُنہرے بال!

جیون ——— آشا سو رہی ہے ——— تمہاری آنکھوں میں بھی میٹھی میٹھی نیند کا خمار ہے ——— مجھے تمہاری آنکھیں بہت پسند ہیں!

سُدھا ——— آپ سو جائیے

جیون ——— ہاں، سُدھا! مجھے سو ہی جانا ہے۔ زندگی خود ایک نیند ہے ——— ایک خواب ہے ——— لیکن زندگی ایک خمارِ گراں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

(وقفہ)

سُدھا! ——— قرنوں سے اِنسان زیست کے چراغ میں اپنے دِلوں اور آنکھوں کی جوت جلاتے آئے ہیں۔ اِس تجلّی سے اُنہوں نے منزل ڈھونڈنے کی کوشش کی ——— ناکام کوشش۔ آخر وہ بجھے ہوئے چراغ چھوڑ گئے ——— اُن کے بعد کی نسلیں آئیں۔ اُنہوں نے اُن بجھے ہوئے چراغوں کو پھر سے روشن کیا ——— لیکن آج تک سبھی اپنی راہیں ڈھونڈنے میں ناکامیاب رہے ہیں ——— لیکن آج تک اِن چراغوں میں دلوں کے ارمان اور آنکھوں کی جوت جلائی جاتی ہے ——— یہ چراغ اُمیدیں ہیں ——— مَیں سو جاؤں گا تو تم یہ اُٹھالو گی اور تم نیند میں ڈوب جاؤ گی تو کل کی آشا اِس چراغ کو اُٹھالے گی ———

(کراہنے لگتا ہے)

لیکن یہ چراغ!

یہ اُمیدیں!!

اِن کی روشنیاں ہوشربا ضرور ہیں

لیکن یہ صرف پتہ دیتی ہیں

اُن راہوں کا

جن پر قرنوں سے اِنسان چلتے آئے ہیں

اُن راہوں کا

جن کی منزل نہیں ہے

بھٹکتے رہنا تو زندگی کا مُنتہا نہیں؟

لیکن یہ چراغ!

میری آشا!!

(جیون بیہوش ہو جاتا ہے۔ سُدھا دریچوں پر پردے گرانے کو اُٹھتی ہے۔ لیکن جذبات کی شدّت سے سحر زدہ سی دریچے ہی میں کھڑی رہ جاتی ہے۔ وہ باہر دیکھتی ہے۔ چاند کو اور چاند کی ضیا کو ——— اُونچے اُونچے یوکلپٹس کے پیڑوں کو ——— پھر مُنہ پھیر کر جیون کو دیکھتی ہے اور بڑبڑانے لگتی ہے)

سُدھا ــــــ جیون اور آشا!
ابھی تو میرا دامن اُمیدوں سے بھرا ہؤا ہے
جیون نے مجھے کوئی ایسی یاد بھی تو نہیں دی
جسے میری نگاہیں
ماضی کے پردے چاک کر کے دیکھ سکیں
جس کے سہارے میں زندگی کاٹنے کی سوچ سکوُں
جیون میرے گرد
آشا کی تاریکیاں محیط کر جائے گا
مَیں اِن دریچوں میں کھڑی رہوُں گی
اور اُمنگیں چاندنی میں جلتی رہیں گی
میری مُسکراہٹیں آج تک نہ کھِل سکیں
اور اب یہ سَدا کے لئے بُجھ جائیں گی
اور آشا!　　(چیختی ہے)
آشا!!

(جیون کی بیہوشی ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ اُسے دبے سے لہجے میں پُکارتا ہے)

جیون ــــــ سُدھا!

سُدھا ــــــ جی! (آنسوُ پونچھتی ہوُئی آ کر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

جیون ——— سُدھا! آشا کو تم نے پکارا تھا؟

سُدھا ——— جی! ——— جی نہیں!!

جیون ——— (پریشان لہجے میں) شاید میری رُوح چیخ رہی تھی۔

(چند لمحے خاموشی رہتی ہے)

جیون ——— سُدھا! آشا ایک چراغ ہے، ایک دِیا ہے جس کی روشنی ابھی بہُت پھیکی، مدّھم ہے۔ اِتنی مدّھم کہ کوئی بھی اِس روشنی کے سہارے زندگی کے اندھیروں میں راہ ڈھُونڈنے کی نہیں سوچ سکتا ——— لیکن ایک روز یہ روشنی بہُت تیز ہو جائے گی ——— لیکن وہ ایک دِن کی بات ہے۔ آج یہ ایک ہلکے سے جھونکے سے بھی بُجھ سکتی ہے ——— تمہیں اِس روشنی کو زندہ رکھنا ہے اور اِس روشنی میں تمہیں مَیں بھی مِل جاؤں گا۔

(سُدھا خاموش رہتی ہے)

جیون ——— (گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے) اوہ! ——— ساڑھے گیارہ بج گئے ——— سُدھا! تم سو جاؤ۔

سُدھا ——— ڈاکٹر نے ساڑھے گیارہ بجے آنے کو کہا تھا۔

جیون ——— ڈاکٹر اب کیا آئے گا ——— اور آئے بھی تو اِس سے حاصل کیا ہو گا؟

(کار کا ہارن بجتا ہے)

جیون —— سُدھا! دیکھو تو شاید ڈاکٹر آیا ہے۔

سُدھا —— جی!

(کچھ دیر بعد سُدھا ڈاکٹر کو ساتھ لئے آتی ہے نبض دیکھنے کے بعد ڈاکٹر سُدھا سے مخاطب ہوتا ہے)

ڈاکٹر —— اِنہیں نیند آئی تھی؟

سُدھا —— جی نہیں، یہ تو بیہوشی میں بھی بڑبڑاتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر —— نیند بہت ضروری ہے۔ مَیں انجکشن لگا دیتا ہوں۔

(ڈاکٹر انجکشن لگا کر چلا جاتا ہے۔ اُس کے پاؤں کی چاپ زینے سے آنا بند ہو جاتی ہے۔ سُدھا صوفے میں بیٹھی جیون کی پلکوں کو دیکھنے لگتی ہے —— پلکیں دھیرے دھیرے گرنے لگتی ہیں —— اور وہ بیجان سا ہو کر ہاتھوں کی مُٹھیاں کھول دیتا ہے —— زینے پر پھر پاؤں کی چاپ سُنائی دیتی ہے —— وہ مُڑ کر دیکھتی ہے۔ ڈاکٹر دروازے میں کھڑا ہے)

ڈاکٹر —— مُعاف کیجئے گا آپ کو تکلیف دی۔ میرا بیگ رہ گیا تھا۔

سُدھا —— کوئی مضائقہ نہیں —— تشریف لائیے۔

(ڈاکٹر سُدھا کے قریب صوفے پر پڑا ہوا بیگ اُٹھا کر

جانے لگتا ہے)

سُدھا ——— ڈاکٹر صاحب! مَیں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

ڈاکٹر ——— فرمائیے!

سُدھا ——— میرے کمرے تک تو آئیے ——— یہ ساتھ ہی (ہاتھ سے اشارہ کرتی ہے)

(سُدھا نائٹ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے آگے چلتی ہے اور ڈاکٹر پیچھے پیچھے آتا ہے۔ جب ڈاکٹر اُس کے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے تو سُدھا دروازہ بند کر دیتی ہے ڈاکٹر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور سُدھا صوفے کے بازو پر بیٹھ کر کہنی ڈاکٹر کے کاندھے پر ٹکاتے ہوئے اُسے مخاطب کرتی ہے)

سُدھا ——— ڈاکٹر صاحب! آپ کا کیا خیال ہے اِن کے متعلق؟

ڈاکٹر ——— مُشکل ——— جی، جی نہیں! ——— اُمید ہے ———!!

سُدھا ——— ٹھیک کہئے ——— ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر ——— آپ تو اِن کی ——— (فقرہ اُدھورا چھوڑ دیتا ہے)

سُدھا ——— کچھ نہیں ———!

ڈاکٹر ——— یہ کسی لمحے بھی دَم توڑ سکتے ہیں ——— اِن کا بچنا ناممکن ہے۔

(ایک لمحے کے لئے سُدھا کا سَر چکرا جاتا ہے لیکن وہ خود

کو سنبھال لیتی ہے۔ مسکراتے ہوئے وہ ڈاکٹر کے گلے سے بازو لپٹا کر اُس پر جھک جاتی ہے۔ ــــ بڑے کمرے سے جیون کی آواز گونجتی ہے ــــ وہ بیہوشی میں پکارتا ہے)

جیون ــــ سُدھا! ــــ سُدھا!! ــــ (آواز ڈوب جاتی ہے)

(سُدھا، ڈاکٹر کو پلنگ پر بٹھا دیتی ہے اور ڈاکٹر سے پوچھتی ہے)

سُدھا ــــ یہ کب تک سوئے رہیں گے؟

ڈاکٹر ــــ یہ صُبح سے پہلے بیدار نہیں ہونگے۔

(سُدھا، نائٹ گاؤن صوفے پر پھینک دیتی ہے ــــ بجلی گُل ہو جاتی ہے اور وہ ڈاکٹر کی آغوش میں سما جاتی ہے)

(ایک طویل وقفے کے بعد سین بدلتا ہے)

ڈاکٹر ــــ (اندھیرے میں) اب مَیں چلتا ہُوں۔

(بجلی کا سُوِچ اون کر دیتا ہے)

سُدھا ــــ پھر کب آئیے گا؟

ڈاکٹر ــــ (مُسکراتے ہُوئے) کل شام

(ڈاکٹر، زینہ اُتر جاتا ہے۔ کار سٹارٹ ہو جاتی اور پھر انجن کی آواز مدھم ہوتے ہوتے گُم ہو جاتی ہے۔ سُدھا پر نیند کا غلبہ

طاری ہو جاتا ہے ——— وہ خواب دیکھنے لگتی ہے)

(سین بدلتا ہے)

دھواں ——— رنگ برنگ دھواں ——— ہرے، نیلے، پیلے رنگ ایک دوسرے میں غلط ملط ہونے لگتے ہیں ———

آہستہ، آہستہ دھواں کم ہونے لگتا ہے اور رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں۔ وہ دھوئیں میں آگے بڑھنے لگتی ہے ———

ایک کمرہ ہے کشادہ، وسیع۔ دیواروں پر تصویریں آویزاں ہیں۔ ایک سنہرے فریم میں ایک حسین تصویر ہے ——— پائیں باغ میں ایک لڑکی کھڑی ہے۔ لڑکی پھول توڑنے لگتی ہے۔

"پھول مت توڑو ——— حسن کو اتنا سنگ دل نہیں ہونا چاہیئے۔"

"تمہاری وہ تصویر بہت اچھی تھی۔"

ہرے، نیلے، پیلے دھوئیں ایک دوسرے میں غلط ملط ہو گئے ———

"تم بھی آجاؤ ——— گاڑی کی رفتار تیز ہو جائیگی ——— جلدی کرو۔"

سٹیشن پہ لگی ہوئی بڑی گھڑی ٹوٹ گئی ———

"اب میں وقت کیسے دیکھوں گی؟"

"میرے پاس گھڑی ہے ——— سُنہری گھڑی ———

میرا بہت بڑا مکان ہے"

"لیکن تم تو بیمار ہو"

"آشا ہماری بیٹی ہے ——— اُس کی آنکھیں بالکل تُم سے

ملتی ہیں"

"اُس کے بال آپ کے بالوں کی طرح حسین ہیں"

"آگ جل رہی ہے، لیکن تُم کہاں جا رہے ہو؟"

بڑے مکان کو آگ لگ گئی ———

ہرے، نیلے، پیلے دھوئیں ایک دُوسرے میں غلط ملط

ہو گئے ———

"کتنی اچھی جگہ ہے ——— پھُولوں کی بھینی بھینی خوشبو ———

میں کچھ پھُول توڑ لوں؟"

"ہاں! ضرور ——— یہیں کچھ پھُول ہیں ——— اِس

سے آگے تو بہت پتھریلی راہ ہے ——— کانٹے ہی

کانٹے ہیں ———"

"یہاں پلنگ پہ بیٹھو ——— اُسے کب تک ہوش آئے گا؟"

"صبح تک"

"بجلی بجھا دو ——— میرا گاؤن گم ہو گیا ہے۔"

ہرے، نیلے، پیلے دھوئیں ایک دوسرے میں غلط ملط ہو گئے ———

"ان کا بچنا مشکل ہے۔"

"میرے پاس دو شیشے ہیں۔"

"ایک صبح تک ٹوٹ جائے گا۔"

"آشا میری بیٹی ہے۔"

"میں کل بھی آؤں گا۔"

سیاہ دھواں اُبھرنے لگتا ہے ——— ہرے، نیلے، پیلے رنگ سیاہیوں میں ڈوب جاتے ہیں ——— چیخیں گونجنے لگتی ہیں ———

ایک قہقہہ گونجتا ہے۔

"ایک شیشہ ٹوٹنے لگا ہے۔"

(سدھا چیخ مار کر اُٹھ بیٹھتی ہے)

——— سدھا! (جیون کی آواز گونجتی ہے)

سدھا ——— ناتھ!

(سدھا تیزی سے چلتی ہوئی جیون کے کمرے میں داخل

ہوتی ہے)

جیون —— سُدھا! آشا کہاں ہے؟

سُدھا —— سو رہی ہو گی۔

جیون —— (پکارتا ہے) آشا —— آشا —— آشا —— !!!

(آشا دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے اور روتی ہوئی جیون کے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے)

جیون —— میری بیٹی! —— (اور آشا کی پیٹھ سہلانے لگتا ہے)

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

جیون —— سُدھا! —— آشا کی زندگی کی مشعل میرے ہاتھوں سے گرا چاہتی ہے۔ تُم اِس مشعل کو تھام لو۔ اِس سے پہلے کہ یہ گر کر ہمیشہ کے لئے بُجھ جائے —— میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل رہا ہے ——

(آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کراہنے لگتا ہے۔ آشا سسکیوں میں رونے لگتی ہے —— جیون کی نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں —— اور وہ موت کی بیہوشی میں بڑبڑاتا ہے)

جیون —— میرے گرد آگ جل رہی ہے
یوکلپٹس کے پیڑ جل رہے ہیں
چاندنی نے آگ لگا دی ہے

چاند کی مسکراہٹ نوچ ڈالو
دریچوں پر پردے گرا دو
میری نبضیں
میری نبضیں ڈوب رہی ہیں

(جیون خاموش ہو جاتا ہے۔ اکھڑی ہوئی سانس ہمیشہ کے لئے ڈوب جاتی ہے۔ آشا خوف سے بیہوش ہو جاتی ہے۔ سُدھا، جیون کی نبض پر انگلیاں رکھتی ہے۔ نبض بند ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ بے جان سی صوفے پر گر جاتی ہے اور اپنا منہ ہاتھوں میں ڈھانپ لیتی ہے ——— وہ رونا چاہتی ہے لیکن رو نہیں سکتی۔
ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ اِدھر اُدھر پڑی میز، کرسیوں کا سہارا لیتی ہوئی ٹیلی فون تک جاتی ہے)

سُدھا ——— ہیلو!

آواز ——— میں ڈاکٹر اجیت بول رہا ہوں۔ میں شام کو ضرور آؤں گا۔ میں نے سب لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ میں شام کے بعد کسی مریض کو دیکھنے نہیں آسکتا ——— ہاں! وہ کیسا ہے؟

(سُدھا، سحر زدہ سی حالت میں ٹیلیفون کا ریسیور کانپتے ہاتھوں میں لئے کھڑی خلا میں گھورتی ہے)

سُدھا ـــــ وُہ ! ـــــ وُہ !! ـــــ نبضیں ڈوب گئیں ـــــ

نبضیں .... !!!

ـــــ (ایک قہقہہ گونجتا ہے) ـــــ ہا ـــــ ہا ـــــ ہا

ـــــ ہا !!!

(ٹیلی فون کا ریسیور سُدھا کے ہاتھوں سے گر جاتا ہے نیم جان سی وہ صوفے میں آکر گر جاتی ہے ـــــ آشا کو ہوش آجاتا ہے اور وہ چیختی ہوئی آکر سُدھا کی گود میں سر رکھ دیتی ہے۔ سُدھا کو اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ وہ نیم وا آنکھوں سے دریچوں سے باہر دیکھتی ہے ـــــ یوکلپٹس کے اُونچے اُونچے پیڑوں کو ـــــ ڈھلی ہوئی صبح کو ـــــ اُس کی نگاہیں واپس جیون کے چہرے پر آجاتی ہیں۔ وہ خوف سے چیخ اُٹھتی ہے اور اُسے یُوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کمرے میں قہقہے گونج رہے ہوں)

تُم ایک نیا ساتھی ڈھونڈ لینا

آشا ایک مشعل ہے

اِس کی روشنی میں، مَیں بھی تمہیں مِل جاؤں گا

مَیں انجکشن لگا دیتا ہوں

میرا بیگ رہ گیا ہے

میرا گاؤن گُم ہو گیا ہے
بجلی بُجھا دو
میری نبضیں ڈوب رہی ہیں
وہ کیسا ہے!
دُہ! ــــــ دُہ!!
نبضیں ڈوب گئیں!!!
(قہقہہ)
ہا ــــ ہا ــــ ہا ــــ ہا!!!!

نغمہ

پلکوں کی سیاہ جھالروں کے پیچھے، آنکھوں کے سُرخ ڈوروں کے بیچ، پُتلیوں کی نیلی گہرائیوں میں شوخیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں ——
وہ سراپا پیکرِ جذبات بنی ہُوئی گا رہی تھی ——

YOURS TiLL THE STARS LOOSE THEiR GLORY

YOURS TiLL THE BiRDS FALL TO SiNG ——

اُس کا اندھا خاوند پیانو بجا رہا تھا اور سوچ رہا تھا —— روزی اُس کی ہے —— روزی اُس کی ہے جب تک ستارے اپنی ضیا نہیں کھو دیتے، طیور اپنے گیت نہیں کھو دیتے! اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا —— روزی اُس کی ہے، روزی کسی کی نہیں ہو سکتی۔ وہ مُسکرا رہا تھا اور نغموں کا دِل دھڑک رہا تھا۔

ہر پیالہ ناچ رہا تھا، ہر بوتل جھوم رہی تھی، ہر آنکھ نشیلی تھی، ہر گھونٹ اُمنگوں کی دُنیا تھا۔ اُس کی کمر لچک رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی نیلی گہرائیوں میں شوخیاں تھیں ——— اور وقت ٹھہر گیا تھا۔ ہر آنکھ پیاسی تھی، ہر اُمنگ بیتاب تھی ——— ہر دھڑکن ایک ٹیس تھی ——— اور وہ گا رہی تھی، ناچ رہی تھی۔ ناگن کی مانند بل کھاتی ہوئی، میزوں کے درمیان لچکتی جا رہی تھی۔ ریسٹورانٹ میں آکر وقت ٹھہر گیا تھا۔ ریسٹورانٹ سے پہلے اور بعد کچھ نہ تھا۔ شاید کوئی کچھ جاننا ہی نہیں چاہتا تھا ——— اور ہر نگاہ مدہوش تھی، ہر دل مدہوش تھا، جیسے تخیّلات کی کوئی حسین بستی مل گئی ہو، کوئی اپسرا انگڑائی مل گئی ہو ——— پیاس کی مدہوشی تھی، بیہوشی، نیند ——— خوابوں کی دُنیا حقیقتوں سے کہیں دور ——— بہت دور۔

پیانو کا ہر سُر ایک دھڑکن تھا ——— ایک دھڑکن، ایک نغمہ۔ ہر سُر پہ، ہر دھڑکن پر، ہاتھ پیمانوں کی طرف لپکتے جا رہے تھے۔ وہ شراب پیمانے میں ڈھالنے لگا تو روزی نے اُس کے ہاتھ سے بوتل لے لی ——— بوتل جھوم اُٹھی، شراب مُسکرا اُٹھی۔ اُس کا ہاتھ کپکپا گیا۔ پیانو کا ہر سُر نغمہ بن گیا، ہر سُر ایک دھڑکن اور ہر دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ پھر نغمے اُلجھنے لگے، دھڑکنیں اُلجھنے لگیں ——— ساز خامشی کی جانب بڑھنے کے لئے تیزی سے بجنے لگے جیسے کسی مرنے والے

کی سانس رُکنے کے لئے تیز ہو گئی ہو ——— ! کیبرے (CABARET)
کا پہلا نمبر ختم ہو گیا۔ ہال تالیوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔ اور اِدھر نگاہیں اُلجھی پڑی تھیں، دھڑکنیں اُلجھی پڑی تھیں، سانسیں اُلجھی پڑی تھیں۔ پھر نگاہیں سُلجھنے لگیں، سانسیں سُلجھنے لگیں، دھڑکنیں سُلجھنے لگیں۔ ایک سُلجھاؤ جس کی گرہ اُلجھنوں سے بھی زیادہ مضبوط تھی ——— !

اندھا آرتھر جھک کر پسندیدگی کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا ——— کاش، وہ اِس دُنیا کو دیکھ سکتا، جس میں وہ جی رہا تھا۔ کتنا حسین تھا بلوریں پیمانوں میں چھلکتی ہوئی شراب کا رنگ ——— ! کاش، وہ دیکھ سکتا کتنے حسین ہیں وہ ہونٹ اور کتنی نشیلی ہیں وہ آنکھیں، جن کے وہ گیت گاتا ہے ! ——— ایک دن اُس نے سوچا تھا کہ آئندہ وہ کسی ریسٹورانٹ سے معاملہ نہ کرے گا۔ وہ پھر کبھی دُوسروں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹیں کھلانے کے لئے نہ گائے گا۔ وہ کیوں گائے؟ ——— ہاں، کیوں ؟ ؟ اُس نے سوچا تھا ——— جبکہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مُسکراہٹ کیا ہوتی ہے ؟ آنکھوں میں کیا ہوتا ہے ؟ جسے دیکھ کر لوگ اپنے دِلوں کا سکون و قرار لُٹا بیٹھتے ہیں۔ لیکن اسی ریسٹورانٹ میں آج بھی وہ پیانو بجا رہا تھا اِس لئے کہ دھڑکنوں کا تسلسل قائم تھا ——— تالیاں بج رہی تھیں۔ لیکن آرتھر ! وُہ تو اندھا تھا ——— اندھی حسرتوں کا اندھا مُجسمہ ! کاش، وہ ایک جھلک اِس دُنیا کی دیکھ

سکتا! کتنی ننھّی معصوم اور کومل خواہش تھی؟ وہ گردن جھکائے لوگوں کی پسندیدگی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ دُنیا میں کیا نہیں ہو جاتا، کیا نہیں ہو سکتا، کیا ممکن نہیں؟ ——— لیکن یہ کیوں ممکن نہیں کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں اِس دُنیا کے چند حسین رنگ جذب کر لے؟ اور سب کچھ ممکن ہے تو یہ کیوں نہیں ہو سکتا، یہ کیوں نہیں ہو سکے گا ——— ؟ وائلنسٹ (VIOLONIST) نے اُسے سہارا دیا اور وہ صوفے میں دھنس گیا۔

پروفیسر کے گلاس میں شراب ڈھالتے ہوئے شاعر بولا ———

"پروفیسر، زندگی ایک گراں خواب ہے اور اِس خواب سے بیداری کا نام موت ہے۔ مگر پروفیسر، اِس کے بعد، بیداری کے بعد ——— موت کے بعد ——— ؟"

"یہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔" پروفیسر پیمانہ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"بکواس! بکواس!! ——— تمہیں اِس کا جواب ہی نہیں معلوم ——— ہر اُس سوال کا جواب احساس ہے، جس کا حل ہمیں معلوم نہیں۔ پروفیسر، موت کے بعد، جسے تم بیداری کا نام دیتے ہو ——— کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں ——— تم مجھے پاگل، بیوقوف اور جاہل کہہ سکتے ہو، لیکن مجھ سے بڑے پاگل، مجھ سے بڑے جاہل، مجھ سے بڑے بے وقوف تم ہو،

تُم جیسے لوگ ہیں جو فلسفے کی ڈگریاں اپنے ناموں سے چسپاں کر کے، اپنے بالوں کو کاندھوں تک بڑھا کر، دُنیا کو دھوکا دے رہے ہیں اور دیتے آئے ہیں۔ تُم خود کچھ نہیں جانتے۔ مجھے بتاؤ، تُم نے کب خُدا کی ہستی کو محسوس کیا ہے؟"

"ارے اندھے! خُدا کے بغیر یہاں ——— اِس دُنیا میں کیا ہو سکتا ہے ——— کیا ہو سکتا تھا؟ خود کو دیکھ! تیرا وجُود ہی خُدا سے ہے۔ یہ آواز، یہ جو تُو بول رہا ہے، آخر کیسے بول رہا ہے؟ اندھے! اِس دُنیا میں ہر چیز مادّہ ہے اور یہ تمام دُنیا جس کا وجُود زمین پر ہے، اِسی زمین میں مِل جائے گی۔ اِس لئے کہ مادّہ کبھی ایک شکل و صُورت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ متحرّک ہے، سدا متحرّک! تیرا وجُود بھی مادّہ ہے۔ یہ جسم خاک ہے، خاک سے بنا ہے اور خاک میں مِل جائے گا، لیکن کیا تُو یہ سمجھتا ہے کہ اگر خاک کو خاک ہی میں مل جانا تھا تو یہ دُنیا کیسے وجُود پا سکتی تھی؟ ——— نہیں، مادّیت سے بلند رُوحانیت ہے۔ رُوح نہیں مرتی ——— رُوح کی نیند ٹوٹتی ہے موت کے بعد اور موت رُوح کی بیداری ہے ——— پھر خُدا کے متعلق کچھ کہنے کو باقی رہ جاتا ہے؟"

"ریڈیو بج رہا ہے نا، پروفیسر؟"

"ہاں!"

"ریڈیو بھی مادّہ ہے نا؟"

"ہوں!"

"یہ بھی خاک ہی میں مِل جائے گا نا؟"

"ضرور! ــــــــ یہ جن دھاتوں سے بنا ہے، اِسی زمین سے اِنسان نے ڈھونڈ نکالی ہیں ــــــــ یہ بھی خاک ہیں۔"

"یہ ریڈیو بھی مادّہ ہے مگر میری طرح بول رہا ہے ــــــــ تُم "والز" (WALTS) سُن رہے ہو۔ اگر تمہیں یہ علم نہ ہو کہ ریڈیو میں یہ آواز کیسے آ رہی ہے تو تمہیں ریڈیو میں بھی رُوحانیت نظر آنے لگے گی ــــــــ جسے تُم اپنے الفاظ میں صرف محسُوس کر سکتے ہو۔ اگر کسی مادّی ہستی میں آواز کا ہونا ہی خُدا کے وجُود کا ثبُوت ہے تو تمہارا ایک خُدا مارکونی بھی ہے، ایک خُدا نیوٹن بھی ــــــــ"

"اندھا! بیوقُوف! ــــــــ کیا دلیل دی ہے!" پروفیسر چراغ پا ہو گیا اور شاعر نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

بلئیرڈ ٹیبل پہ رُکے ہُوئے ہاتھ جُنبش میں آ گئے۔ گیمبلنگ مشین پہ سلوٹ (SLOT) میں ٹوکن پھسلنے لگے ــــــــ قہقہوں کے حباب اُبھرے اور پھُوٹتے چلے گئے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

کیبرے کے دُوسرے نمبر کا وقت ہو رہا تھا۔ روزی اب تک جوزف کے ساتھ بیٹھی تھی ــــــــ لیکن اب تک دونوں کے ہونٹوں کو جُنبش نہ ہُوئی

تھی۔ آج اُس نے پروفیسر اور شاعر کی گفتگو میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ صرف ہاتھ بڑھتے رہے تھے اور شراب حلق میں اُنڈیلتے رہے تھے۔ دونوں کھوئے کھوئے سے تھے۔ نہ جانے ایک دُوسرے سے کیا کہنا چاہتے تھے؟ شاید یہ کہ کتنے پُرسکون ہیں یہ لمحے؟ —— وہ چند لمحے جو گُزر چکے تھے، گُزرتے جا رہے تھے۔ کاش، نہ گُزرتے! وقت چند لمحے اور ساتھ دے دیتا! لیکن لمحے تو گُزرتے آئے ہیں، گُزرتے جا رہے ہیں، گُزرتے چلے جائیں گے۔ چند لمحے جو سدا سے زِیست کا حاصل بنے رہے ہیں!

وائلنسٹ نے وائلن کا کوئی تار زور سے چھیڑ دیا۔ تار چیخا —— اور اُن دونوں کی دھڑکنیں چیخ اُٹھیں۔ دونوں نے ایک دُوسرے کی آنکھوں میں جھانکا —— حسرت سے، مایُوسی سے، یُوں جیسے کسی ممّی خانے میں دو حنوط کردہ لاشیں قرنوں کی نیند کے بعد جاگ اُٹھی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ یہ تو وُہ دُنیا نہیں جس میں ہم جی رہے تھے —— جس میں ہم جینا چاہتے تھے! اور ہر شخص سے کتنی دُور ہے وُہ دُنیا جس میں وہ جینا چاہتا ہے ——

وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اُس کے ہونٹوں کے حسین گوشوں پر مُسکراہٹ نمُودار ہوئی۔ جوزفؔ کی نگاہیں اُس کے ساتھ ہی اُٹھیں اور اُن حسین گوشوں پر پھیلی ہُوئی مُسکراہٹ سے اُلجھ گئیں۔ وُہ مُسکرا دیا۔

"دُوسرے نمبر کے بعد ——!" کہہ کر وہ میزوں کے درمیان

لچکتی ہوئی چلی گئی۔

وہ پیانو کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ پیانو پر اندھے آرتھر کی انگلیاں تیزی سے چلنے لگیں۔ ایک "پیج بوائے" (PAGE BOY) دیوار پر آویزاں کیبرے کے نمبروں میں سے پہلا نمبر اتار کر لے گیا۔ بلیرڈ ٹیبل سے ہٹ کر لوگ کرسیوں اور صوفوں میں دھنس گئے۔ گیمبلنگ مشین میں ٹوکن پھسلنا بند ہو گئے۔ آرکیسٹرا کے نغمے سے دلوں میں جذبات انگڑائیاں لینے لگے ——— نغمہ، نغمے کے بعد شراب ——— شراب، شراب کے بعد روزی ——— ! نگاہوں میں جلن پیدا ہو چلی تھی۔ حرص، ہوس ——— اور اگر نگاہوں سے کسی کے کپڑے اتارے جا سکتے تو روزی اس وقت برہنہ ہوتی۔ اس کا احساس اندھے آرتھر کو بھی تھا۔ وہ بھی محسوس کر سکتا تھا کہ لوگ پیانو، وائلن اور گٹار کی دلکش دھنیں سننے نہیں آتے۔ لوگ تو آتے ہیں صرف شراب کے لئے، ——— روزی کے لئے ——— شراب اور روزی کے لئے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر روزی نہ ہوتی، روزی کا حسن و جمال نہ ہوتا، ہوٹل کا مالک روزی کی آنکھوں کی نیلی گہرائیوں میں نہ کھو جاتا تو اسے سات سو روپے کا کنٹریکٹ بھی نہ مل سکتا ——— لیکن یہ سب جانتے ہوئے، محسوس کرتے ہوئے بھی وہ مجبور تھا۔ جیسے ہر شخص مجبور ہے ——— حالات کا اسیر ہے ——— اور مجبوریوں نے اسے سکھا دیا تھا ضمیر کو کچل کر مسکرانا۔ وہ مسکرا رہا تھا

—— وہ مسکرا رہا تھا اور اُس کی اُنگلیاں پیانو کے سُروں سے کھیل رہی تھیں —— یُوں، جیسے آج تک اُس نے زندگی میں مسکراہٹوں کے سوا کچھُ پایا ہی نہ ہو۔ اُس کی اُنگلیاں نغمے کی دھڑکنوں سے کھیل رہی تھیں۔

سُر لپکے اور سَم پر آ گئے۔ روزی نے آواز سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ گا نہ سکی۔ وہ پیانو سے ہٹ کر آرتھر کے پاس آ کر بولی ——

"مجھ سے گایا نہ جائے گا۔"

"کیوں؟"

"آواز نہ جانے کہاں ڈوب گئی ہے!"

"اچھا، مَیں گاتا ہُوں —— مگر ڈارلنگ، وہ سیٹھ —— ہوٹل کا مالک —— دیکھنا، چلّانے لگے گا۔ خیر کوئی بات نہیں، تم بیٹھو!"

آرتھر نے ایک ہسپانوی گیت شروع کیا ——

ہوٹل کے مالک نے بالکونی سے مینجر کو اشارہ کیا۔ جب مینجر مالک کے پاس پہنچا تو شراب کے نشے میں دھت مالک چلّایا

"روزی کیوں نہیں گاتی؟ —— روزی سے کہو گائے!"

"اُس کا گلا خراب ہے" مینجر سر جھکائے ہُوئے بولا۔

اور جواب میں ہوٹل کے مالک کا سر صوفے کی پُشت پر گر گیا۔

روزی صوفے میں بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں تین شخص اُبھر

آئے ——— ہوٹل کا مالک، جوزف اور آرتھر ——— جوزف، ہوٹل کا مالک اور آرتھر ——— ہر ترتیب میں آرتھر سب سے آخر میں آتا۔ اُس نے نگاہیں بالکونی سے ہٹائیں تو وہ جوزف پر آکر رُک گئیں۔ وہ اُٹھی اور جوزف کی میز پر آگئی۔

"مَیں بیٹھ سکتی ہُوں؟"

"ضرور! لیکن آؤ ناچیں، رقص کریں ——— یہ ہسپانوی دُھن ——— وہ ایک لڑکی ہے، سُرخ ہونٹوں اور نیلی آنکھوں والی ——— ! مجھے بے حد پسند ہے۔"

دونوں ناچنے لگے۔ کچھ اور لوگ بھی ناچ رہے تھے۔ اُن دونوں کے قریب، ستون کا سہارا لئے ہُوئے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ ستون کی ٹھنڈی سطح سے رُخسار لگائے نشے میں بڑبڑا رہی تھی ——— "مَیں سوچتی ہوں ڈارلنگ! مَیں ابد تک یُونہی ناچتی رہُوں ——— تُمہارے ساتھ ناچتی رہُوں ——— زندگی بھر، زندگی کی آخری سانس تک۔ آؤ ڈارلنگ! میرے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دو۔ مَیں تمہاری آنکھوں میں تحلیل ہو جانا چاہتی ہُوں، تُمہارے جِسم میں جذب ہو جانا چاہتی ہُوں!" چند لمحے وہ اِسی طرح ستون کی خُنک سطح سے رُخسار لگائے خاموش کھڑی رہی پھر زور سے چلّائی ——— "وِسکی! ——— بیرا، وِسکی!!"

لیکن وِسکی کی قیمت ہے ——— قیمت! اور قیمت مِل سکتی تھی اگر وہ

اپنے جسم سے گوشت نچوا سکتی ——— کسی کے ساتھ ایک رات گزار سکتی ——— مگر ریسٹورانٹ کے مالک کا سر صوفے کی پشت پر ڈھلک چکا تھا ورنہ اُسے وِسکی مِل چکی ہوتی۔

"وِسکی! ——— وِسکی!!" وہ پھر چلّائی۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر آواز نہیں اُبھرتی تھی۔ وہ شاید کہنا چاہتی تھی ———

"یہ جسم لے لو ——— مجھے خرید لو ——— وِسکی کے عوض ———!"

اُس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر بلاؤز میں جذب ہونے لگے اور وہ پھر "وِسکی! ——— وِسکی!!" چلّاتی ہوئی دونوں ہاتھوں سے سکرٹ اُٹھانے لگی۔ ایک مُنحنی شکل وصورت کے آدمی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے اپنے پاس بٹھا کر اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وِسکی کا گلاس اُس کے ہاتھ میں دے دیا ——— وِسکی کا ایک گلاس! ——— انسان کی قیمت، ضمیر کی قیمت، عصمت کی قیمت، عورت کی قیمت ——— عورت کی قیمت، وِسکی کا ایک گلاس ———!!

شراب تھک گئی، پیالہ مضمحل ہو گیا، بوتل نڈھال ہو گئی۔ روزی کی نشیلی آنکھوں میں شوخیاں بُجھ سی گئیں، اُس کی کمر تھک گئی ——— وقت تھک گیا، ہر نگاہ مایوس ہو گئی، ہر اُمنگ بُجھ گئی ——— آرکیسٹرا بج رہا تھا، مگر ناچ بند ہو گیا۔ وہ بوجھل قدموں سے میزوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی جوزف کی میز پر آ گئی۔ ریسٹورانٹ میں جو کچھ بھی تھا دھوکا

تھا، فریب تھا ——— ہر نگاہ مایوس ہو گئی تھی جیسے کسی سراب کی حقیقت سے آشنا ہو گئی ہو ——— پیاس تھی، جلن تھی، بیہوشی تھی۔ حقیقتوں سے قریب ——— تخیّلات کی دُنیا سے کہیں دُور ——— بہت دُور ———!

روزی نے جوزف کی آنکھوں میں جھانکا۔ ساز تیزی سے بج رہے تھے۔ دُوسرا نمبر ختم ہو رہا تھا۔

* * * * * *

ساز کلائمکس پر آکر خاموش ہو گئے۔ نغمے ڈُوب گئے۔ ڈُوبے ہُوئے دل، تھکے ہُوئے ہاتھ نہ تو نغمے کی دلکشی سے متأثّر ہو سکے، نہ داد ہی زور سے بج سکے اور نغموں کا دِل ڈُوب گیا۔ اندھے آرتھر نے سر جھکائے ہُوئے سوچا ——— یہ شرابی، مدہوش، بیہوش، یہ کیا داد دے سکیں گے؟ اگر یہ آرٹ کی داد دے سکتے، دینا جانتے تو یہ شراب نہ پیتے۔ اگر اِن میں اپنی کمزوریوں اور دُوسروں کی بلندیوں، اپنی مایوس زندگی اور دُوسروں کی پُرسطوت زندگی کی برداشت ہوتی تو یہ شراب نہ پیتے۔ یہ تو شراب پیتے ہی اِس لئے ہیں کہ یہ بھُول جانا چاہتے ہیں غم کو، خوشی کو، اپنے آپ کو، اپنے وجُود کو۔ اِنہیں تو خود سے نفرت ہے، یہ تو پیتے ہی اِس لئے ہیں کہ اِنہیں اپنے وجُود کا احساس تک نہ رہے۔

آرتھر صوفے میں بیٹھ گیا۔ بیرے نے اُس کے ہاتھ میں کافی کا پیالہ

دے دیا۔ اُس نے کافی کا گھونٹ بھرا تو اُسے اپنی ماں یاد آگئی۔ اُس نے ایک دفعہ اپنی ماں سے پوچھا تھا ——— "ماں، کافی کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟" ——— تو اُس کی ماں رونے لگی تھی اور وہ معصومیت سے بولا تھا ——— "ماں، روؤ نہیں۔ اگر میں دیکھ سکتا تو ہرگز نہ پوچھتا" ——— اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ پیالہ اُس کے ہاتھ سے گِرتے گِرتے بچا۔ اُس کی بے نور آنکھوں میں نمی آگئی، اُس کی پلکیں بھیگ گئیں اور کیوں کر نہ بھیگتیں؟ اُس کی ماں کے سِوا آج تک کسی نے اُس سے ہمدردی کے جذبے کے تحت نہیں پوچھا تھا کہ وہ کب سے اندھا ہے۔ "نہیں پوچھا تھا" اُس نے سوچا ——— اور اُس کے دِل میں نہ جانے کتنی بار یہ خواہش مچل چکی تھی کہ کاش، وہ اُس شخصیت کو ایک بار دیکھ سکتا، جس نے اُس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ ہمدردی کے وہ چند الفاظ ——— اُن الفاظ سے اُسے بصارت نہیں ملی تھی، وہ تو آج تک اندھا ہی تھا۔ لیکن وہ الفاظ ——— وہ بے قیمت الفاظ، جن کی ادائیگی میں کسی کو کوئی قیمت نہیں ادا کرنا پڑتی، وہ الفاظ بھی اُسے آج تک کوئی نہیں دے سکا تھا۔

"آرتھر! ہمارے ساتھ بیٹھو" پروفیسر نے آرتھر کو پکارا۔

"کیا پیو گے، آرتھر؟"

"کچھ نہیں، شکریہ!! میں نے ابھی کافی پی ہے۔"

"پروفیسر، مجھے بتاؤ، ہم کیوں زندہ ہیں؟" شاعر شراب کے گلاس سے کھیلتا ہوا بولا۔

"بہت ٹیڑھا سوال ہے، شاعر! رات کی سیاہی سے بھی زیادہ دبیز اور معشوق کی زلف سے بھی زیادہ پُر پیچ —— ہر خم کے بعد ایک خم باقی رہ جاتا ہے۔" پروفیسر ہنستے ہوئے بولا۔

"پروفیسر، ہم تمام عمر جیتے ہیں —— یہ عمر کل تک کی بھی ہو سکتی ہے اور نصف صدی بعد تک کی بھی —— مگر بات ایک ہی ہے۔ کل تک زندہ رہیں یا نصف صدی بعد تک —— پروفیسر، اگر زندگی کا کوئی حاصل ہی نہیں۔ کل کی موت کے بعد بھی کچھ نہیں اور نصف صدی بعد کی موت کے بعد بھی کچھ نہیں تو ہم جیتے کیوں ہیں —— ؟ زندہ کیوں رہتے ہیں —— ؟"

"خدا کو مانتے ہو؟"

"نہیں!"

"پھر تمہاری سمجھ میں نہیں آسکے گا۔"

"پروفیسر، تم بکواس کرتے ہو۔ تم ایک سوال کا جواب دوسرے سوال سے دیتے ہو۔ مجھ سے پوچھو، میں بتا سکتا ہوں۔"

"ہاں، ہاں، ضرور بتاؤ!"

"زندگی سے نہ تو پہلے کچھ ہوتا ہے نہ بعد۔ بیج خاک میں گرتا ہے اور

پھوٹتا ہے، درخت بن جاتا ہے۔ ایک درخت کے بعد ایک درخت پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر کسی درخت میں بھی کوئی مشابہت نہیں —— ہر درخت دوسرے سے بالکل مختلف ہے اور اگر یہ مان لو تو ایسے ہی ہم اور تم بھی ——"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ایسا بھی کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ شاید خدا ہے!"

شاعر نے ایک ہی سانس میں گلاس میں پڑی ہوئی وسکی حلق میں انڈیل لی اور تیزی سے دروازے کی طرف چل دیا۔ پروفیسر کے قہقہے نے دروازے تک اس کا تعاقب کیا۔ شاعر جلدی سے باہر نکل گیا۔

"آرتھر، یہ شاعر بالکل پاگل ہو گیا ہے۔" پروفیسر بولا۔

"مگر پروفیسر، خدا پر سے میرا بھی اعتقاد اٹھتا جا رہا ہے۔" آرتھر ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم بھی پاگل ہو چلے ہو آرتھر۔ خدا ہے اور ضرور ہے —— اپنی طرف دیکھو آرتھر، تم کیا ہو؟ سوچو! انسان ہی تو خدا کا سب سے عظیم شاہکار ہے ——"

"سوچا ہے پروفیسر، اور سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خدا بھی میری طرح ایک فنکار ہے —— صرف ایک فنکار۔ میرے نغمے زندہ نہیں رہ سکتے لیکن اس کا فن! اس میں زندگی ہے لیکن اس سے چند تصویریں ایسی بھی بن جاتی ہیں جو اسے اپنے نام سے منسوب نہ کرنی

چاہئیں ——— وہ مجھ جیسے اندھے بھی تو پیدا کرتا ہے اور ایسے بھی جن میں مجھ سے بھی زیادہ خامیاں ہیں ——— اور اگر وہ خدا ہے ——— وہ عظیم فنکار ہوتے ہوئے بھی خامیاں چھوڑ جاتا ہے تو وہ خدا نہیں ——— صرف ایک فنکار ہے ——— میرے جیسا جو کبھی کبھی لَے سے گر کر نغمے کی موت کر دیتا ہو ——— تو پھر وہ خدا کہاں ؟

"اعمال! ——— آرتھر، یہ اعمال ہیں!"

"ہاں پروفیسر، یہی کہنا پڑتا ہے۔ اچھا، بیرے کو آواز دیجئے، مجھے پیانو تک پہنچا دے۔ ابھی تیسرا نمبر باقی ہے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ جتنی جلدی وقت گزر سکے بہتر ہے۔ یوں تو میری زندگی، بغیر آنکھوں کے، ایک نیند ہی ہے ——— ایک نیند ہی میں گزر رہی ہے!"

* * * * * *

ریسٹورانٹ تقریباً ویران ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگ جا چکے تھے۔ وہ منحنی شکل وصورت کا شخص اُس لڑکی کو ساتھ لئے دروازے سے باہر جا رہا تھا ——— شاید وِسکی کی قیمت وصول کرنے کے لئے۔ دوسرے لوگ جو ابھی بیٹھے تھے ایک ایسی دُنیا میں تھے جہاں ہوش وخرد دم توڑ چکے تھے، ایک وقتی موت کی گود میں سو چکے تھے، سب بے حس تھے، بے جان تھے! ——— مگر کیبرے کا تیسرا نمبر ضروری تھا، لازمی تھا، کوئی سُننے والا ہو یا نہ ہو ——— اور ساز گنگنانے لگے ———

دونوں اب تک خاموش بیٹھے تھے۔ نہ جانے وہ ایک دوسرے سے کیا چھپا رہے تھے؟ کیا تھا جو کہنا چاہتے تھے؟ مگر کہہ نہیں سکتے تھے۔

"تم نے اب تک کوئی بات نہیں کی؟ دوسرے لوگوں کی طرح مجھ سے کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی؟" روزی نے سکوت کو توڑا۔ اس کی آواز میں کھوکھلا پن تھا ——— یوں جیسے اس کی آواز میں خلا ہو۔

"میں کچھ جاننا نہیں چاہتا۔ تم سامنے ہو اور بس!" جوزف نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں! تمہیں میرے متعلق کچھ تو جاننا ہی چاہیئے ——— جیسے یہی کہ میں اس کی بیوی ہوں"۔ روزی نے آرتھر کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا! وہ تمہارا خاوند ہے؟" جوزف نے یوں کہا جیسے وہ اس بات سے، اس انکشاف سے بالکل متاثر نہ ہوا ہو۔

"تم پہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا؟" روزی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں ——— بالکل نہیں!" وہ ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا کہنا چاہیئے!" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی بولی۔

"میں بھی نہیں جانتا مجھے کیا کہنا چاہیئے!" جوزف کی آواز میں جذبات کی آمیزش تھی۔

معاً دلوں کی دھڑکنیں گنگنا اُٹھیں۔ روزی کی پلکوں کی سیاہ جھالروں کے پیچھے، آنکھوں کے سُرخ ڈوروں کے بیچ، پُتلیوں کی نیلی گہرائیوں میں شوخیاں انگڑائیاں لینے لگیں ——— اُس کی نظروں کے سامنے اُونگھتے ہوئے پیمانے ناچنے لگے ——— بوتلیں جھُوم اُٹھیں ——— اُمنگیں جگمگا اُٹھیں۔

"اچھّا، اب مَیں چلُوں گا۔" جوزف اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہُوئے بولا۔

"کل آؤ گے نا؟" روزی کے لہجے میں پیار بھرا اصرار تھا۔

"ہاں، آؤں گا!"

اور وُہ دروازے کی طرف بڑھا، لیکن دروازے پر جا کر اُس کے قدم رُک گئے۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ روزی پیانو کے قریب کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ ساز سَم پر آ گئے اور وُہ گانے لگی ———

SAY GOOD NIGHT BUT NOT GOOD BY———

"شب بخیر کہو میرے محبُوب، ——— خُدا حافظ نہ کہو!" ———

اور اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں ——— میرے محبُوب، پھر بھی آنا!

جوزف نے مُسکراتے ہُوئے اُسے شب بخیر کہا اور دروازہ کھول کر باہر نِکل گیا۔

اندھا آرتھر پیانو بجاتے ہُوئے مُسکرا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ

روزی اُس کی ہے جب تک ستارے اپنی ضیا نہیں کھو دیتے، طیور اپنے گیت نہیں کھو دیتے اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ روزی اُس کی ہے روزی کسی کی نہیں ہو سکتی ——— وہ مسکرا رہا تھا اور نغموں کا دل دھڑک رہا تھا ؎

عورت ایک پہیلی

جب سے وہ اِس نئے مکان میں آیا تھا۔ اُسے یُوں محسُوس ہونے لگا تھا جیسے اُس کی خواہشات میں آگ لگ گئی ہو۔ ایک بس اُسی کا کمرہ تھا جس میں کوئی اپنی گھر گرہستی لئے ہُوئے نہ تھا، ورنہ ارد گرد کے تمام کوارٹروں میں عورتوں، بچّوں کی بھرمار تھی۔ زندگی کو وقت کیسے ٹیڑھے راستوں پر بھٹکنے کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایک دِن تھا کہ اِن کمروں میں ایک ایک آدمی بمشکل گذارہ کر پاتا تھا، لیکن آج وہ وقت ہے کہ کِسی ایک کمرے میں دس بارہ سے کم لوگ نہیں رہتے۔ اِن بچارے مہاجروں کی تو ایسی حالت ہے جیسے بُہت سے مُرغے مُرغیاں شور و غُل کرنے پر بھی زبردستی ایک ڈربے میں بند کر دیئے گئے ہوں۔ لیکن نہ جانے یہ پنجابی کِس مِٹّی کے بنے ہُوئے ہیں! یہ اِن تمام مُشکلات کے باوجُود ویسے ہی بے فِکرے ہیں جیسے اِس آگ کے طُوفان سے پہلے

ہوتے تھے۔ یہ اب بھی ہنستے ہیں، کھیلتے ہیں، گاتے ہیں۔ اگر اِن لوگوں کے رہنے بسنے کا مُناسب بندوبست ہو گیا ہوتا، تو شاید ان کی روزمرّہ کی زندگی کو دیکھ کر کوئی اِتنا اندازہ بھی نہ کر پاتا کہ یہ لوگ اپنے گھروں سے صِرف تن کے کپڑے لے کر نِکلے تھے۔

معمُول کے مطابق وہ ہر شام کو پونے پانچ بجے کی بس میں بیٹھ کر پانچ بجے گھر پہنچ جاتا۔ شیروانی کھونٹی پہ ٹانگ کر اور کاغذ پنسل لے کر لکھنے بیٹھ جاتا، لیکن جب سے وہ اِس نئے مکان میں آیا تھا، اُسے یُوں محسُوس ہونے لگا تھا، جیسے اب وہ اور کچُھ نہ لکھ سکے گا۔ بس جو کچُھ وہ لِکھ چکا، لکھ چکا۔ وہ کئی افسانوں کے پلاٹ ذہن میں لئے گھر آتا، لیکن جب کاغذ پنسل لے کر بیٹھتا تو اُسے یُوں محسُوس ہونے لگتا، جیسے اُسے کوئی کشش باہر کھینچ رہی ہو۔ عورت! ——— عورت!! اُس کا تخیّل اُن تمام عورتوں کو ننگی کر کے دیکھنے لگتا، جنہیں تمام دِن میں اُسے دیکھنے کا اتّفاق ہُوا تھا اور سوچتے سوچتے اُس کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگتیں۔ وہ برآمدے میں آ کر کھڑا ہو جاتا۔ عورتیں، جوان لڑکیاں، مردوں سی دھوتیاں باندھے جھنگ کی اکھڑ پنجابی میں ایک دُوسرے سے باتیں کرتی ہُوئی جاتے کتنی مرتبہ غسلخانوں میں جاتیں، کبھی نہانے، کبھی کپڑے دھونے، کبھی پانی لانے ——— اور وہ کھڑا اُن عورتوں کو دیکھتا رہتا۔ اُس کی نگاہیں اُن کے جوان جسموں کو ٹٹولتی رہتیں۔ جب کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا اور مردانے

انداز سے باندھی ہوئی دھوتی کے پٹ ادھر اُدھر ہو جاتے ــــــ ٹانگوں کی جھلک نظر آ جاتی ــــــ اُس کے بازوؤں میں سختی پیدا ہو جاتی، پٹھے تن جاتے اور اُس کی بے چینی بڑھنے لگتی ــــــ اُس کے جی میں آتی کہ وہ اُن میں سے کسی ایک کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لے۔ اتنے زور سے کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں ــــــ!

تمام دن دفتر میں وہ فائلوں پر بے دلی سے قلم گھستا رہتا۔ بار بار اُس کی نگاہیں دیوار پر لگی ہوئی بڑی گھڑی پر چلی جاتیں۔ دن کا ایک بجا ہوتا اور وہ گھڑی اس اُمید سے دیکھتا کہ شاید پونے پانچ بج گئے ہوں۔ بس کے انتظار میں دو دو گھنٹے کھڑے رہنے کی کوفت سے بچنے کے لئے اُس نے دفتر سے پندرہ منٹ پہلے اُٹھنے کی اجازت لے رکھی تھی۔ جب وہ گھر پہنچتا تو جس عورت پر بھی نظر پڑتی، وہی بن سنور کر بیٹھی ہوتی۔ کئی ایک برآمدے میں کھڑی اپنے خاوندوں کا انتظار کر رہی ہوتیں۔ انہیں دیکھ کر اُس کے جذبات اور بھڑک اُٹھتے۔ کئی مرتبہ اُس نے سوچا کہ اب وہ اندھیرا ہونے پر گھر لوٹا کرے گا۔ لیکن جونہی شام کے پونے پانچ بجتے وہ ایڈیٹر دل اور دوستوں کے آئے ہوئے خطوط جیب میں ٹھونس کر بس سٹینڈ کی طرف چل پڑتا۔ وہ خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا تھا، جیسے اب اُس کا خود پر قابو نہ رہا ہو ــــــ اُس کے دل و دماغ باغی ہو رہے تھے۔

جس دِن اُس نے اپنے دوست پاؔل کے یہاں رہنے کا بندوبست کر کے اپنا سامان اُس کے یہاں لا کر پھینکا تھا، اُس کے بعد کا دن اِتوار تھا۔ پاؔل اور وہ دونوں برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے "وہ" نکلی اور پاؔل نے آنکھ دبا دی۔ جب وہ غسلخانے کے دروازے پر پہنچی تو اُس نے پھر مُڑ کر دیکھا اور پاؔل پھر مُسکرا دیا۔ ساتھ والے کمرے سے ایک زرد رُو، پست قامت، تپلا دُبلا آدمی باہر آ کر بولا

"پاؔل صاحب! کیا وقت ہُوا ہے؟ ــــــ"

"ساڑھے گیارہ۔" پاؔل نے مُسکرا کر جواب دیا اور وہ پھر اندر چلا گیا۔

وہ غسل خانے سے لَوٹ کر آئی اور پھر پاؔل کو کنکھیوں سے دیکھتی ہُوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اِس بابُو کی بیوی ہے جو ابھی ٹائم پُوچھ رہا تھا!" پاؔل بولا۔

"لیکن یہ تو بہُت جوان ہے اور بابُو ــــــ"

"تو کیا ایسے بابُو کی یہ بیوی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں، میرے منہ سے یُوں ہی نکل گیا تھا ــــــ کیا نام ہے اِس کا؟"

"کیلاش!" پاؔل نے سرگوشی میں جواب دیا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے پاؔل اور اُس نے کھانا کھایا اور کپڑے پہن کر سینما دیکھنے چلے گئے۔ سینما سے آنے کے بعد جب بھی اُس کی نظر کسی عورت پر پڑتی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے کیلاش کی تصویر آ جاتی ــــــ وَیسے

ہی کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی ـــــــ اور پھر پاآل کا آنکھ دبانا ـــــــ وہ پاآل کے بازوؤں میں بازو ڈال کر بولا۔

"پاآل! بھئی وہ تیری کیلاآش تو ایسی ہے کہ بس....."

"ہاں! ہے تو ـــــــ لیکن بھئی شادی شدہ عورت ہے۔ میرا تو حوصلہ نہیں پڑتا۔ تم کوشش کر دیکھو۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بہت دیر تک بے مقصد کناٹ پلیس میں گھومنے کے بعد وہ گھر لوٹ آئے۔ شام اور دنوں کی طرح گپیں ہانکتے اور تاش کھیلتے گذری۔ وہ رات بھی اُس نے آدھی جاگ کر کاٹی۔

صبح برآمدے میں کیلاآش کو اُس نے دو تین بار دیکھا۔ وہ اُسے بھی کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی پاس سے گذری۔ اُس نے جان بوجھ کر ایک لمبی سانس بھری اور وہ مسکراتی ہوئی اُس کے قریب سے گذر گئی۔ اُس کے جی میں آئی کہ آج دفتر رخصت کی درخواست بھیج دے اور کیلاآش کو غسل خانے میں پکڑ لے۔ پھر اُسے اُن تین چار فائلوں کا خیال آگیا جو اُسے اُسی روز افسر کو پیش کرنی تھیں اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دفتر چلا گیا۔

تمام دن میں نہ جانے اُس نے کتنے سگرٹ پھونک ڈالے۔ اُس نے کئی مرتبہ وہ ضروری فائلیں اُٹھائیں، لیکن وہ ایک حرف بھی نہ لکھ سکا۔ اُس کے سیکشن کا انچارج، عینک کو ناک کے بانسے پر کھسکا کر اُسے گھورتا رہا۔ لیکن وہ خود کو بے بس سا محسوس کر رہا تھا۔ اُسے کسی چیز کی

ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے کسی عجیب سی بے چینی، اضطراب کا احساس ہو رہا تھا جس پر وہ قابو نہ پا سکتا تھا ——— کیلاش! ——— عورت!! ——— ہوا کے تیز جھونکوں سے مردانہ انداز سے باندھی ہوئی کیلاش کی دھوتی کے کھلے ہوئے پٹ ——— گوری گوری پنڈلیاں ———

اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ قلم دوات اُٹھا کر اُس نے دراز میں رکھ کر چابی گھما دی اور چابیوں کا گچھا جیب میں ڈالتے ہوئے اُس نے اپنے میز پر بکھرے ہوئے کاغذ ترتیب سے رکھ دیئے اور سگرٹ سُلگا کر بے دلی سے کرسی میں گر پڑا۔

"مسٹر ونود! وہ ضروری فائلیں تم نے راؤ صاحب کو پیش کر دیں؟" اُس کے انچارج شرما کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"کل کر دوں گا۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اُس نے دھواں اُگلتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

"ہوں! خیر، لیکن کیا بات ہے مسٹر ونود تم چند روز سے بہت پریشان سے رہتے ہو؟ پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوتا تھا کہ تمہاری میز پر کام پڑا ہو۔ آج راؤ صاحب بھی پوچھ رہے تھے کہ بہت دنوں سے تمہارا کم کام دیکھنے میں آتا ہے اور پھر جگہ جگہ غلطیاں ——— وہ سٹیٹ منٹ جو تم نے پچھلے ہفتے بنایا تھا، اُس میں تمام ٹوٹل غلط تھے۔ کہو تو تمہیں کسی اور ٹیبل کا کام دے دوں؟" شرما اُسے گھورتے ہوئے بولا۔

"ابھی رہنے کو جگہ نہیں ہے۔ سامان ایک دوست کے پاس رکھا ہُوا ہے اور سوتا ایک اور دوست کے پاس ہوں۔ حیران ہو گیا ہوں کہ کیا کروں؟ کبھی سوچتا ہوں نوکری چھوڑ کر گھر چلا جاؤں اور اگر چند روز اور انتظام نہ ہُوا تو مجھے نوکری چھوڑنا ہی پڑے گی ——— اور ——— اور تو کوئی خاص بات نہیں لیکن یہ کیا کم پریشانی ہے!" اُس نے بہانا تراشا۔

"تمہاری شادی ہو چکی ہے؟" شرما بولا۔

"نہیں!" وہ اِس عجیب سے سوال پر پھٹی پھٹی آنکھوں سے شرما کو دیکھتے ہُوئے بولا۔

"اوہ! میرے ایک دوست ہیں، اُن کے پاس ایک کمرہ ہے کرایہ کے لئے، لیکن وہ کِسی شادی شُدہ کو دینا چاہتے ہیں، جو اپنی بیوی کے ساتھ رہے ——— بال بچّے دار آدمی ہو ———"

وہ خاموش رہا۔ گھڑی پر نظر ڈالی، پونے پانچ بج چُکے تھے۔ ٹیبل پر ایک نظر ڈال کر وہ دفتر سے باہر نکل آیا۔ بس میں بیٹھا ہُوا وہ سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھی ہُوئی لڑکی کو گھُورتا رہا جس کا عکس ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے لگے ہُوئے شیشے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کِتنا اچّھا ہوتا، اگر وہ بھی شادی شُدہ ہوتا۔ آج اُسے ایک اچّھا مکان تو مِل گیا ہوتا لیکن مکان؟ ——— آج کل دہلی میں مصالحے دار چاٹ سے لے کر عورت تک ہر چیز مِل سکتی ہے، لیکن مکان نہیں مِل سکتا۔ پھر اُسے مکان کِس

طرح مِل جاتا ؟

بس سے اُتر کر رامو پنواڑی کی دُکان سے اُس نے ایک پیکٹ سگرٹ لی اور پان کھا کر اپنے مکان کی طرف چل دیا۔ اُس کے راستے میں جتنے بھی کوارٹر آتے، تقریباً ہر ایک میں ایک عورت —— بیوی بنی سنوری کھڑی اپنے خاوند کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ کاش! اُس کی بیوی بھی یُونہی بنی سنوری برآمدے میں کھڑی اُس کا انتظار کر رہی ہو۔

"اُنسٹھ روپے پندرہ آنے تنخواہ اور بیوی ؟" وہ بڑبڑایا۔

وہ سوچنے لگا۔ اُنسٹھ روپے پندرہ آنے میں ایک بیوی کا بوجھ اُٹھانا کتنا دُشوار ہے! اور پھر بچے —— ایک سے دو، دو سے تین اور سلسلہ قائم —— لیکن تنخواہ وہی اُنسٹھ روپے پندرہ آنے —— غیر ممکن! —— اِس سے بہتر تو یہ ہے کہ کہیں بھاڑے کی بیوی مِل جائے۔

"بے وقوف!" اُس نے خُود کو سمجھایا۔

اِدھر اُدھر لوگوں کی بہو بیٹیوں کو تاکتے جھانکتے ہُوئے وہ دو منزلے کوارٹروں کے سامنے آ گیا جس کی اُوپر والی منزل میں اُس کا کوارٹر تھا۔ اُس نے اُوپر نگاہ دوڑائی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ زینہ پر چڑھتے ہُوئے اُسے اُس شادی کا خیال آ گیا، جو ساتھ والے بلاک میں ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ پنجابی کیسے عجیب انسان ہوتے ہیں ؟ اِنہیں روٹی ملے نہ ملے، لیکن عورت کے بغیر یہ نہیں رہ سکتے۔ جب سے مہاجر یہاں آنے لگے ہیں، اُس

وقت سے آج تک نہ جانے وہ کتنی "شرنارتھی شادیاں" دیکھ چکا تھا۔ زینہ طے کر کے جب وہ اپنے کوارٹر کی طرف مڑا، تو کیلاش فرش دھو رہی تھی۔ اُس کے کمرے کے سامنے کا تمام فرش جہاں شاید کیلاش نے کوئلے توڑے تھے، سیاہ ہو رہا تھا۔ وہ اُس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اُسی طرح فرش دھوتی رہی۔ پھر اُس نے اُس کے کمرے کے سامنے بھی پانی گرا دیا، اور فرش دھونے لگی۔ وہ باریک دھوتی میں سے جھلکتے ہوئے جوان جسم کو دیکھتا رہا——

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے والے بلاک میں کھڑی ہوئی بوڑھی عورت اُسے گھور رہی تھی۔ اُس نے ایک ہاتھ سے پاجامہ سنبھالا اور دوسرے سے قفل کھول کر اندر چلا آیا لیکن اُس کے منہ سے نکل ہی گیا۔

"آج تو بہت صفائی ہو رہی ہے؟"

وہ جواب میں مسکرا دی۔ وہ دروازے میں کھڑا بہت دیر تک اُسے گھورتا رہا۔ وہ بھی کنکھیوں سے دیکھتی رہی۔ مردانہ انداز سے باندھی ہوئی دھوتی میں سے جھلکتا ہوا جسم—— گوری باہیں—— اُبھرا ہوا سینہ—— اور سامنے والے بلاک میں کھڑی ہوئی بوڑھی عورت—— اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کچھ دیر بعد وہ فرش دھو کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شیروانی اُتار کر اُسے وہیں کھڑے کھڑے اچھال کر پلنگ پر پھینک دیا اور باہر برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ دیر تک کھڑا نہ جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔ سیڑھیوں

پر سائیکل چڑھانے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"پال! آج تو بہت جلدی آ گئے!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم تو گارڈ ڈیوٹی پر ہو نا؟" اپنی طبیعت کے مطابق فقرہ کس کر پال سائیکل سٹور روم میں رکھنے چلا گیا۔ کیلاش پھر دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر سیڑھیوں پر سائیکل چڑھانے کی آواز ہوئی۔ اُس نے زینے کی طرف دیکھا تو کیلاش کا خاوند تھا۔ کیلاش نے لپک کر اپنے خاوند کے ہاتھ سے سائیکل پکڑ لی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"آج بہت دیر کر دی آپ نے؟"

"نہیں تو! کیوں صاحب کیا بجا ہے؟" وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"ساڑھے پانچ۔" اُس نے کلائی گھما کر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

پال کے پاؤں کی چاپ سُن کر وہ اُس کی طرف متوجّہ ہوا۔ پال اُسے بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹتے ہوئے بولا۔

"تم ایک کام کرو!"

"کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"وہ جو لیڈیز واچ تم نے کبھی ہونے والی بیوی کے لئے خرید رکھی ہے کیلاش کو نذر کر دو!"

"منظور ہے لیکن ——————"

"ارے بھائی! یُونہی دینے کو تو نہیں کہتا۔ کچھ لے لو، کچھ دے دو!"

"پھر کچھ مدد کرو نا۔"

"یہ بزنس ابھی شروع نہیں کیا۔" پال نے پھر فقرہ کسا۔

ہنستے ہُوئے وہ دونوں کپڑے بدل کر پارک میں ٹہلنے کو نکل گئے۔ پارک کی سڑک پر بچھی ہُوئی سُرخ بجری پر چلتے ہُوئے وہ سوچنے لگا کہ اگر ان ہرے ہرے گھاس کے ٹکڑوں کے بیچوں بیچ یہ سُرخ بجری نہ بچھی ہُوئی ہوتی تو یہ پارک کتنا بے رنگ ہوتا! جیسے عورت کے بغیر اس کی زندگی —— جیسے کسی بیوہ کی مانگ۔ اس نے قریب سے گذرتی ہُوئی عورت کی چمکتی ہُوئی سُرخ مانگ پر نگاہ ڈالی۔ مانگ مُسکرا رہی تھی —— عورت مُسکرا رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں پھر بجری پر آ رہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ جیسے بجری بدلتی رہتی ہے، ایسے ہی سُرخی بھی بدلتی رہتی ہے۔ مانگ وہی ہوتی ہے لیکن سُرخی نئی —— سڑک وہی ہوتی ہے لیکن بجری نئی —— بجری بچھائی جاتی ہے چلنے والوں کے پیروں سے پسنے کے لئے، اور مانگ دکھانے کے لئے۔ لیکن جیسے بجری طرح طرح کے پیروں سے پسنے کیلئے ہوتی ہے، ایسے ہی مانگ کبھی کسی کو دکھانے کے لئے، کبھی کسی کو اور خاوند! —— سڑک تو وہی ہے، مانگ تو وہی ہے —— لیکن فرق صرف اتنا ہے —— پیر طرح طرح کے —— چلنے والے طرح طرح کے اور نگاہیں نئی نئی —— جیسے کیلاش کے لئے ——

پال، وہ اور نہ جانے کتنے ——————

——————

جب کبھی کوئی حسین تیتری لونڈر کی خوشبو سے معطر جوان جسم لئے اُس کے قریب سے گذرتی تو وہ بے قابو ہو جاتا۔ کئی بار پال نے اُسے ٹوکا، لیکن وہ ہر بار مُڑ مُڑ کر اُس عورت کو دیکھنے لگتا —— جیسے کوئی بھوکا ہر اچھی بُری چیز پر پل پڑتا ہے، ویسے ہی اُس کی بھوکی نگاہیں ہر عورت کے جسم کو ٹٹولنے لگتیں۔

"پال! عورت کیا ہے؟" وہ ایک بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"عورت، عورت ہے! کیوں؟" پال نے مسکرا کر جواب دیا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ پال، پال ہے، لیکن میں کہتا ہوں اُلّو کا پٹھا ہے۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"بُرا مان گئے؟ بھئی میں نے تو کبھی اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ عورت، عورت کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ تم کیوں فضول اپنا دماغ خراب کرتے ہو!"

"پال! آج کوٹھے پر چلا جائے۔ کتنے پیسے چاہئیں اس کے لئے؟"

"یہی چالیس پچاس۔"

وہ پریشان ہو گیا۔ چالیس پچاس؟ اتنے روپے اُس کے پاس نہیں ہیں۔ اُس کی نگاہیں جُھک گئیں۔ سُرخ بجری! —— سُرخ مانگ! کیلاش!! ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اُبھر آئی۔ کیلاش

—— سُرخ مانگ! —— ہاں، یہ بہت اچھی آڑ ہے، جس کے تلے بہت سے کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔

کچھ دیر بعد وہ پارک سے لوٹتے ہوئے یوں مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگا، جیسے وہ کبھی پریشان ہی نہ تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ ہنستے ہوئے بولا:

"پال! میں کل دفتر نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"کل شام کو بتاؤں گا!"

"کہیں پڑوسن سے تو ٹائم مقرر نہیں کر لیا؟ لیکن بچّہ جی، سنبھل سنبھل کر پگ دھرنا، کہیں کوارٹر نہ چھوڑنا پڑ جائے!"

اُس کے جی میں آئی کہ وہ چلّا چلّا کر کہے "پال! وہ مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھتی ہے۔ اُس کی اِک اِک ادا میں دعوت ہے" لیکن وہ خاموش رہا۔ اُس نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

خاموشی سے آ کر وہ لحاف میں گھس گیا لیکن رات دو بجے تک اُسے نیند نہ آئی۔ اُسے اپنے ہاتھ پاؤں سے آگ نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔۔ وہ جذبات کی شدّت سے پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ پال سو چکا تھا۔ بہت دیر تو وہ طبیعت پر جبر کر کے لحاف میں گھسا رہا، لیکن اُس سے رہا نہ گیا۔ بجلی جلا کر وہ بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ٹالسٹائی کا ایک ناول اُٹھا کر آرام کرسی میں بیٹھ گیا —— صبح چار بجے تک پڑھتا رہا، لیکن مشکل بیس صفحے پڑھ سکا۔ وہ

ایک فقرہ ختم کر کے جب اگلا فقرہ پڑھنے لگتا تو پچھلا سب بھول جاتا۔ آخر نیند اُس پر غلبہ پا گئی۔ اُس کے جذبات جوہڑ کے گندے پانی کی مانند خاموش ہو گئے —— جیسے اُن میں کبھی ارتعاش ہوا ہی نہ ہو۔ وہ پھر لحاف میں گھس گیا۔

جب صبح اُس کی نیند ٹوٹی تو دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ پال دفتر جا چکا تھا۔ ہیٹر پر پانی کھول رہا تھا۔ چائے کے تین چار کپ پینے کے بعد اُس کی سستی دور ہو گئی۔ "ہندوستان ٹائمز" کی سرخیاں دیکھ کر وہ نہانے چلا گیا۔ وہ بہت دیر تک شاور کے نیچے بیٹھا رہا۔ جب اُس کا جسم سُن ہونے لگا تو وہ بدن پونچھ کر باہر آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اُس نے کیلاش کو دیکھا۔ وہ نہانے کے لئے غسل خانہ خالی ہونے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُس نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا —— موٹی موٹی آنکھیں، گلابی رخسار، بھرے بھرے بازو، سینے کے کنول، مردانے انداز سے باندھی ہوئی دھوتی کے پٹ —— اُس کا سینہ تپنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اُس نے نہایا ہی نہ ہو۔ پسینے کی چند بوندیں اُس کے ماتھے پر ٹپک پڑیں۔ پھر اُسے احساس ہوا کہ وہ بہت دیر سے اُس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اُس نے خود کو سنبھالا۔ بھاری بھاری قدم اُٹھاتا ہوا وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں پہنچ کر اُس نے بال سنوارے۔ دھلا ہوا کرتہ پاجامہ پہن کر کھانا کھانے بیٹھ گیا، لیکن کیلاش اُسے اپنے ذہن سے مٹتی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کھانا ختم کر کے وہ ہاتھ دھونے غسل خانے کو چل پڑا۔ جب غسلخانے

کے دروازے پر پہنچا تو کیلاش نہا کر باہر نکل رہی تھی۔ اُس نے مڑ کر برآمدے میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ اُس کے قریب جا کر دھیرے سے بولا۔

"کوئی ناراضگی ہے جی ہم سے؟"

"کیا کہا؟" کیلاش کے لہجے میں درشتی تھی۔

"کچھ نہیں!" وہ زیرِ لب مسکراتا ہوا اُس کے قریب ہو گیا۔

"کیا؟" وہ پیچھے ہٹتی ہوئی چلّائی۔

"کچھ نہیں جی!" اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ اُس کا راستہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چلی گئی۔ وہ وہیں کھڑا بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے! وہ کنکھیوں سے دیکھنا ــــــ مسکرانا ــــــ وہ کیا تھا؟ ــــــ ہاتھ دھو کر وہ اپنے کمرے کو لوٹ آیا۔ کیلاش باہر کھڑی اُسے تیز تیز نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر، وہ ماتھا پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُسے اپنا سر جھکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ ہمالیہ کی بلندیوں سے لُڑھک گیا ہو۔

اُس نے سگرٹ سُلگا لیا۔ سگرٹ جل رہا تھا، وہ بھی جل رہا تھا۔ سگرٹ کو جل کر چند لمحوں میں ختم ہو جانا تھا، لیکن اُس کی جلن ــــــ! اُس کے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ دھوئیں کا ہر مرغولہ ایک جوان عورت بنا رہا تھا ــــــ پھر اُسے پچھلی شام کی باتیں یاد آنے لگیں۔ کوٹھا! ــــــ اور طوائف!! ــــــ شیروانی کاندھے

پر ڈال کر وہ بس سٹینڈ کو چل دیا۔

اجمیری گیٹ پہنچ کر وہ بہت دیر تک بازار میں گھومتا رہا۔ یہاں بہت سی عورتوں نے اُسے اُوپر آنے کی دعوت دی۔ اپنے قریب آنے کی ا۔۔۔ اشاروں سے بُلایا۔ اس سے اُسے بہت تسکین ہُوئی۔ وہ سوچنے لگا، یہ عورتیں کیلاش سے کہیں اچھی ہیں۔ یہ کسی کو ٹھکراتی تو نہیں۔ آخر وہ ایک زینے پر چڑھ ہی گیا۔

وہ عورت بالکونی سے اُٹھ کر اُسے لینے زینے تک آئی۔ اُس کا بازو کمر سے لپیٹ کر وہ اُسے کمرے کے اندر لے آئی۔ کمرہ بہت سجا ہُوا تھا۔ اُسے محسوس ہُوا کہ دس روپے جو اُس کے پاس ہیں، بہت تھوڑے ہیں۔

پلنگ پر بیٹھتے ہُوئے وہ آہستہ سے بولا" کیا دینا ہو گا؟"

"صرف چالیس روپے!" اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر وہ اُس کے قریب ہوتی ہوئی بولی۔

"چالیس روپے تو بہت ہیں اور میرے پاس ہیں بھی نہیں!" اُس کے بازو اُس کی گردن کے گرد ڈھیلے پڑ گئے۔

"اِس سے کم نہیں۔ کوئی اور کم قیمت کی دیکھ لو" وہ اُٹھتی ہُوئی بولی۔

"معاف کیجئے، آپ کو تکلیف ہُوئی" وہ اُٹھتے ہُوئے بولا۔

"تکلیف کیسی؟ ہمارا تو کاروبار ہے۔ خریدار آتا ہے، اُسے مال پسند

نہیں یا وہ کم قیمت دینا چاہتا ہے تو دوسری دکان پر چلا جاتا ہے۔"
گردن جھکائے وہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ اُسے ایک ایک قدم اُٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں چالیس روپے گھوم رہے تھے۔ اُن کی کھنک ——— وہ سوچ رہا تھا کتنا اچھا ہوتا اگر آج اُس کے پاس چالیس روپے ہوتے۔ چالیس روپے میں اُسے جذبات کی آسودگی تو مل سکتی تھی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس عورت کی تصویر گھومنے لگی۔ پھر کیلاش کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ وہ سوچنے لگا۔ کتنی عجیب عورت ہے؟ کل تک مسکرا مسکرا کر آگ بھڑکاتی رہی اور آج جلتے پر ایک دم پانی پھینک دیا۔ لیکن عجیب تو شاید ہر عورت ہے۔ یہ رنڈی ——— یہ بھی کتنی عجیب ہے! عورت کو ہم نے خود سینکڑوں روپ دے رکھے ہیں۔ یہ چکلے کی رنڈی عورت ہوتے ہوئے بھی عورت نہیں ہے اور کیلاش عورت نہ ہوتے ہوئے بھی عورت ہے ——— کتنی عجیب بات ہے ——— اپنی جیب میں پڑے ہوئے دس روپے کے نوٹ کو انگلیوں سے محسوس کر کے وہ دیسی شراب کے ٹھیکے میں گھس گیا۔ جب وہ آدھی بوتل ختم کر چکا تو غیرارادی طور پر اُس کی نگاہیں پھسلتی ہوئی باہر سڑک پر آگئیں۔ ایک عورت سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ اُس کی بھری ہوئی مانگ پر نظر پڑتے ہی اُسے پارک میں بچھی ہوئی سُرخ بجری یاد آگئی۔ بجری ——— ! طرح طرح کے پیروں سے


پریم شاستر
اردو تین روپیہ
ہندی تین روپیہ
کام شاستر
اردو تین روپیہ
ہندی تین روپیہ
گربھ شاستر
اردو تین روپیہ
ہندی تین روپیہ
شادی سے پہلے اور شادی کے
بعد یہ کتابیں ضرور پڑھیں!